منشور

خالد علیگ

چراغاں

پیشہ ورقاتلو! یہ جواں خون ہے
محسنو! غازیو! قوم ممنون ہے

خونِ لوح و قلم۔ خونِ فکر و نظر
چشمِ نم یم بہ یم، دیدۂ تر بہ تر
از افق تا افق، از کراں تا کراں!
گولیاں سنسناہٹ، دھماکے دھواں
روشنی کا فسوں خاک میں مل گیا
خونِ انساں کا خوں خاک میں مل گیا
تحفۂ مرگِ جاں آدمی کے لئے
زندگی کے لئے آگہی کے لئے
کتنے سقراط و منصور وارے گئے
کتنے عیسٰی اسی مد میں مارے گئے
بے نمو، بے نشاں، بے ثمر سر بسر
تیرہ و تار تھا کس قدر یہ نگر
تم نے ظلمت کدے کو فروزاں کیا
کیسا پاکیزہ تر یہ "چراغاں" کیا

پیشہ ورقاتلو! یہ جواں خون ہے
محسنو! غازیو! قوم ممنون ہے

یومِ مئی نم

مدیر ـ سبط اختر

قیمت ۲۵ پیسے

مئی سنہ ۱۹۶۵ء

حیات و کائنات کا ترجمان

منشور

مدیر
سبط اختر

جلد نمبر ۲ ۔ شمارہ نمبر ۵

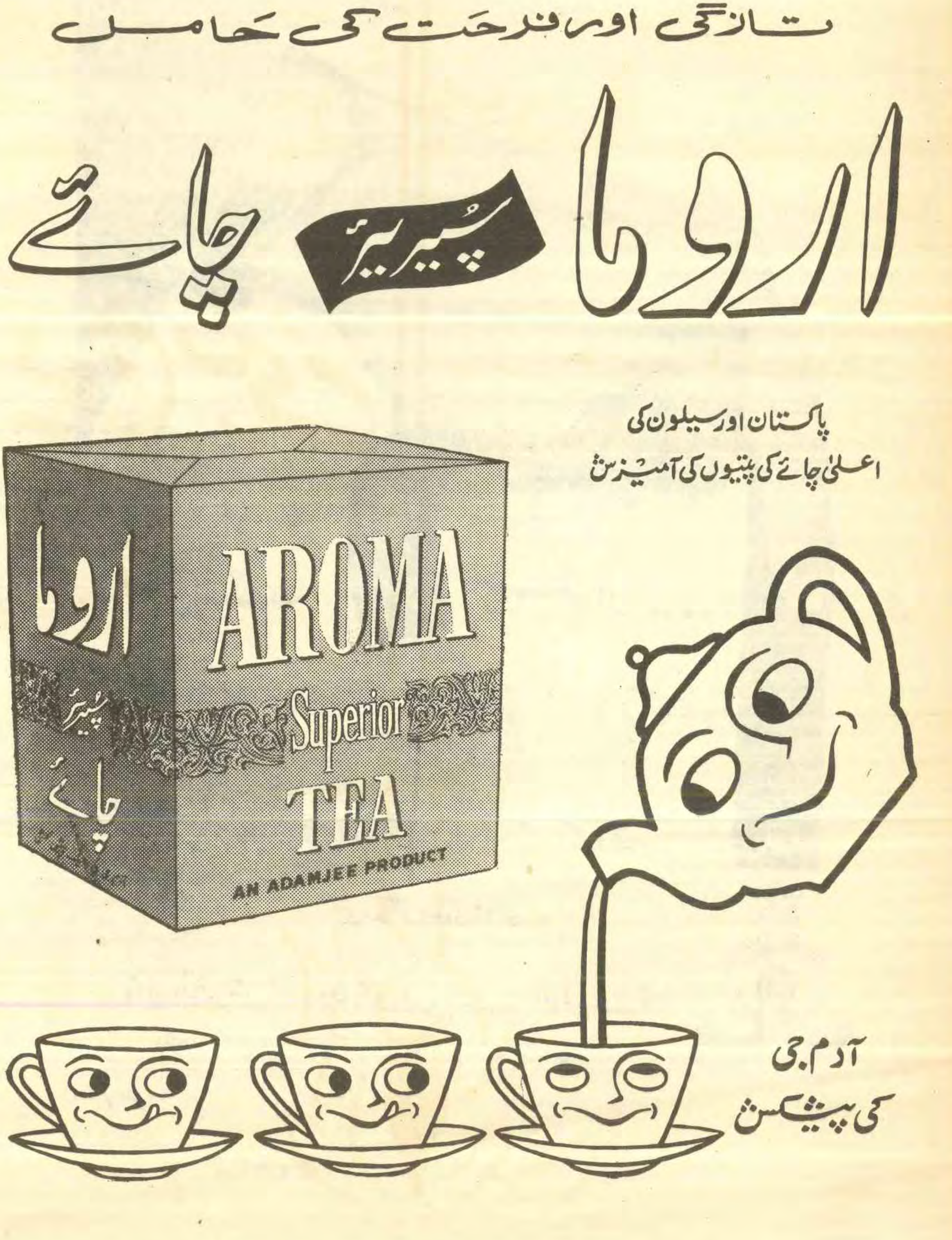
یوم مئی نمبر

قیمت فی پرچہ ۔ پچیس ۲۵ پیسے
سال بھر کیلئے ۔ تین روپے
چھ ماہ کیلئے ۔ ایک روپیہ پچاس پیسے

ناشر: سبط اختر ۔ مشہور پریس میکلوڈ روڈ کراچی

پتہ
منشور: ایروییز ایمپلائز یونین پی آئی اے برانچ کراچی
ایئرپورٹ ۔ فون نمبر ۴۹۱۶۹

اِس منشور میں



تازگی اور فرحت کی حامل
اروما سپیریئر چائے
پاکستان اور سیلون کی
اعلیٰ چائے کی پتیوں کی آمیزش
AROMA
Superior
TEA
AN ADAMJEE PRODUCT
آدم جی
کی پیشکش

یکم مئی ۱۸۸۶ء ——— یہ ایک دن آج پوری انسانی تاریخ کو محیط کئے ہوئے ہے۔ اس دن بطن گیتی میں ایک نئی سوچ نے جنم لینے کی تیاری شروع کی تھی ——— ایک نیا نظام ——— کتابوں کے صفحات سے نکل کر عمل کی کسوٹی پر پرکھا گیا تھا ——— ذہنوں میں طلوع ہونے والے سورج کی کرنیں اسی دن سے زمین پر پڑی تھیں۔

اس دن تک جانے کتنی داستانیں اوراق پارینہ بن کر ماضی کے خاکدان میں دفن ہو گئیں ——— کتنی ہی نئی کہانیوں کے تانے بانے بنے گئے ——— تاریخ نے کتنے موڑ کاٹ ڈالے ——— زمانے نے کتنے انقلابات دیکھے ———، مگر ظالم ظالم ہی رہا ———، مظلوم مظلوم ہی رہا ——— اور یہ اسوقت تک ہوا جب تک کہ مظلوم نے ظالم کی تلوار روکنے کے لئے اپنے بازوؤں کو فولادی ڈھالوں میں تبدیل نہ کر لیا ——— جب تک کہ مظلوم نے اپنی معصوم تمناؤں آرزوؤں اور ارادوں کو سنگ وخشت اور آتش و آہن میں نہ دھار لیا ——— جب تک کہ مظلوم نے اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کی زنجیریں پگھلانے کے لئے عزائم کا الاؤ نہ بھڑکا لیا۔

کتنی تلخ و ترش ہے یہ حقیقت کہ دنیا کا سب سے زیادہ مظلوم طبقہ ——— وہ محنت کش طبقہ رہا ہے جو ہمیشہ کائنات کے در و بام سجاتا رہا ———، جو عروس گیتی کی فکر مشاطگی میں گھلتا رہا ——— جو ذرہ خاک کو ہمدوش ثریا کرنے کے لئے اپنا خون بطور آب استعمال کرتا رہا ———، انسانیت نے پتھر سے جوہر کے عہد تک کا طویل ترین فاصلہ جس کے کاندھوں پر سوار ہو کر طے کیا ہے ——— وہ ہی طبقہ ——— وہ ہی مخلوق فراواں ——— صدہا صدیوں تک شیطان صفت ظالموں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی سسکتی رہی، کراہتی رہی۔ لیکن جب چشم فلک کو بھی اشکبار کر دینے والے ظالم کا پیالہ لبریز ہوا تو چھلک پڑا۔

شکاگو امریکہ کی گلیاں اور چوراہے لرز کر رہ گئے۔ اس دن وہاں جو کچھ ہوا تھا وہ کوئی نئی بات نہیں تھی ——— وہ اسی تاریخ کا، ہماری تمہاری تاریخ کا ایک ورق تھا ——— اور اس کے آگے اور کچھ نہیں، بس صرف و محض یہ ہوا کہ اس دن جہاں جہاں خون مزدور گرا وہاں وہاں بنائے حیات پڑ گئی۔ یہ بنائے حیات ان کے خون سے پڑی تھی جنھوں نے اس دنیا کو کسی فرد واحد یا گروہ کے حوالے کرنے کی بجائے سب کی بنانے کی تلقین کی ——— جنھوں نے کوشش کی کہ ایک ایسی دنیا کی تعمیر ہو جس میں سب ہی ہنس سکیں، سب ہی پیٹ بھر کے روٹی کھا سکیں ———، سب ہی جی بھر کے بڑھ سکیں۔

یوم مئی
حقوق طلب کرنے کا
بین الاقوامی دن

ہم جانتے ہیں کہ منصور کا گلا گھونٹا گیا، عیسیٰ کو صلیب پر سجایا گیا۔ اور اسی طرح فشر، اینجل، اسپائیز، پیرسنز، رابرٹ اور دوسرے مزدور رہنماؤں کو یکم مئی کو "آٹھ گھنٹے یومیہ اوقات کار" ——— کا حق طلب کرنے کے جرم میں پھانسی پر چڑھا یا گیا۔ لیکن ہم اس حقیقت سے بھی آگاہ ہیں کہ تاریخ ان شہیدوں کا ذکر کتنی عزت و احترام کے ساتھ کرتی ہے اور ان کے قاتلوں کا نام تو تاریخ نفرت و حقارت کے ساتھ بھی لینا نہیں چاہتی۔

انسانی محنت، ذہن، عقل و شعور کی تضحیک جس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں کی گئی ہے۔ اسکی مثال کہیں نہیں ملتی ——— مشینیں اس لئے ایجاد ہوئی تھیں کہ محنت و مشقت کی اذیت کم ہو جائے، انسان کو سکون نصیب ہو، معاشرہ ترقی کرے۔ لیکن انھیں مشینوں کو چند افراد نے اپنے دست قدرت میں لیکر انسانی مسرت اور معاشرتی ترقی کو چند چہار دیواریوں، چند محلسراؤں میں مقید کر دیا ——— اور باقی افراد ——— ایک زبردست اکثریت، مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کو سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر اس لئے چھوڑ دیا گیا ——— کہ وہ ان کے چوسے ہوئے خون کے دام کھرے کر لیں اور پھر اسے چمکدار دھاتوں میں تبدیل کرنے کیلئے نئی نئی منڈیوں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں ——— اور پھر ——— سامراجی بن جائیں اس کھلی ہوئی دھاندلی ——— اس کھلم کھلا ظلم ——— کے خلاف کب تک آوازیں بلند نہ ہوتیں ——— وہ آوازیں آخر بلند ہوئیں۔

یکم مئی کو اٹھنے والی یہ آوازیں اس غیر انسانی سلوک کے خلاف تھیں جو سرمایہ داروں نے محنت کشوں کو پاؤں کی دھول سمجھ کر روا رکھا تھا۔ سرمایہ دار اور مزدور متحدہ طور پر اس دن ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے تھے اور آج بھی ہیں۔ آج پیدا کرنے والا ——— پیداوار اور ذرائع پیداوار کو اپنا حق سمجھتا ہے اور اس حق کو حاصل کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔ یہ جذبہ ایک آتش جرار کی صورت میں فلک بوس محلوں اور فصیل بند قلعوں کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہ جذبہ اپنے اندر گرمی بھی رکھتا ہے، حرکت بھی، اور توانائی بھی ——— اور اب کوئی سنہری روپہلی شبنم اس جذبے کو سرد نہ کر سکیگی۔ جب اور جہاں یہ جذبہ بڑھا ہے تو وقت بدلا ہے، وقت بدلا ہے تو ظلم ختم ہوا ہے، بے بسی و بے کسی کے پردے بھی چاک کر دیئے گئے ہیں اور دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ خالق اپنی تخلیق کے مختار بن گئے، نہ دولتمندی کی تخصیص رہی اور نہ عزت کا معیار رہا۔ عظمت کا معیار ——— "سرمایہ" کے بجائے "محنت" سے متعین کیا گیا ——— اور یہ نیا تصور، نیا نظام، نیا معاشرہ وقت کی پکار ——— دائمی للکار ——— بن گیا ——— اسی لئے وہ جو آج تک اوقات کار میں کمی کا مطالبہ کر رہا تھا، آج ہر جگہ اپنی بنائی ہوئی چیزوں پر قبضہ کرنے کے لئے قدم بہ قدم آگے بڑھ رہا ہے کا یہ قافلہ رواں دواں ہے۔

یکم مئی ۱۸۸۶ء کو سرمایہ داروں نے ظالمانہ ہتھکنڈے اختیار کر کے بزعم خود یہ سمجھ لیا تھا کہ فتح انکی ہو گئی۔ حالانکہ شکاگو کے مزدوروں نے جس خون سے مئی تحریک کو سینچا تھا۔ وہ مقدس خون آج ہر طرف ایک آگ بن کر اس کائنات پر چھا گیا ہے۔ اس آگ کی تابناک روشنی نے مزدوروں کو سمجھایا کہ اگر وہ متحد و منظم نہ ہوئے تو سرمایہ دار انھیں، انکی ہی بنائی ہوئی دیواروں میں محبوس اور زنجیروں میں قید کر دیں گے۔ انکی ہی ڈھالی ہوئی سنگینوں سے چھلنی کر دیں گے۔ اس روشنی کی یہ تلقین و ہدایت اور اس تلقین و ہدایت کی پیروی سے ہی یہ بات ثابت ہو گئی کہ جب مزدور، بے روزگار رکھکر یا کر کے تنگ اور پریشان کیا جاتا ہے تو جواباً پھر اسکو بھی اپنے مضبوط جبڑوں سے خود سرمایہ داروں کی ہڈیاں چبانے اور بوٹیاں نوچنے سے دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ مئی تحریک، ایک جاندار متحرک اور ترقی پسند تحریک تھی جس نے یہ سمجھایا کہ جب تک لوٹ کھسوٹ کا موجودہ نظام قائم ہے اس وقت تک معصوم خون بہتا رہے گا ———!

مئی تحریک کے شہیدو، ہمارا اسلام قبول کر کے ہمیں سرفراز کرو کہ ہم نے تمہاری ہی قربانیوں سے یہ یقین اور اعتماد حاصل کیا ہے کہ بہار آئے گی اور بصد شان آئے گی حقیر اور ذلیل حیوان نما انسانوں کے لئے نہیں بلکہ کائنات کے ہر ذی روح کے لئے آئے گی۔ نہ صرف تمہارے بلکہ اب تک بہائے جانے والے مزدوروں کے سارے خون کے ایک ایک قطرے سے دور حاضر کی مزدور تحریک ایک سمندر بن گئی ہے۔ ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر۔ وہ سمندر جس کی لہریں مغرب سے مشرق تک پھیل گئی ہیں اور اس سمندر کے تیز و تند طوفانی ریلے۔ راستے کی تمام رکاوٹوں کو اپنے بہاؤ میں رولتے اور روندتے ہوئے آگے کی طرف ——— مستقبل کی سمت ——— بڑھ رہے ہیں۔!

وہ پرچم جو تم نے بلند کیا تھا وہ آج بھی سر بلند ہے۔ ہم اس امر سے بھی باخبر ہیں کہ ——— تمہارے وقت کی طرح ——— آج بھی سارے سرمایہ دار اس پرچم کو سرنگوں کرنے کے لئے متحد ہیں ——— مگر ہم آج کے باشعور ——— محنت کش تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہارے بلند کئے ہوئے پرچم کو بلند رکھنے کے لئے تمہارے ہی نقش قدم پر چلیں گے۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ۔ اب وہ وقت دور نہیں جب انسانیت کے قاتل اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتیں گے ———!

اے وطن ......

"حکومت، اس ملک میں فلاحی معاشرہ قائم کرے گی"

حالیہ انتخابات سے پہلے، انتخابات کے زمانے میں اور انتخابات کے بعد ہم نے بارہا، یہ اور اسی سے ملتے جلتے جملے سنے اور پڑھے ہیں، اور ان جملوں کی بنیاد پر کافی ہاؤسوں اور ڈرائنگ روموں، چوراہوں، اور اخبارات کے اداریوں میں ہونے والے مباحثوں اور مناظروں کا یہی نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ بھئی حکومت اصلاح اور معقولیت کے موڈ میں ہے۔ یہ باتیں خلوص نیت کے ساتھ کہی جارہی ہیں۔

مگر ہمیں ان نتائج اور قیاس آرائیوں سے یکسر اختلاف ہے۔ ہم ان خالی خولی باتوں سے اتفاق کرنے کے لئے ہرگز آمادہ نہیں۔ باتیں تو نہ جانے کیا کچھ کی گئی ہیں، کی جارہی ہیں اور کی جائیں گی۔ ہم صرف — اور صرف باتوں کے دھوکے اور جادو میں آنے والے نہیں ہیں، ہم تو یہ دیکھیں گے کہ کہنے کے ساتھ ہی ساتھ کیا کیا جارہا ہے — "قول" محض کی اب ہمارے نزدیک کوئی اہمیت اور کوئی وقعت نہیں ہے۔ ہمیں تو "عمل" دیکھنا ہے — ہمیں تو "فعل" کی کسوٹی پر ان اقوال کو پرکھنا ہے۔ لیکن شاید پرکھنے اور جانچنے کا یہ فرض منصبی ہم نے ادا کیا تو کچھ بال کی کھال نکالنے والے بی جمالو ٹائپ کے لوگوں کے جذبات واحساسات مجروح ہوجائیں گے۔ اس لئے مناسب یہ ہوگا کہ حکومت کے سب سے بڑے منتظم اور سب سے اعلیٰ سربراہ، صدر مملکت کے وہ الفاظ سن لیجئے جو انھوں نے مرکزی حکومت کے وزراء اور اعلیٰ سول وفوجی افسران سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے انھوں نے کہا تھا:-

"دولت چند ہاتھوں میں سمٹ رہی ہے کارٹلز بڑھ رہا ہے اور یہ افسوس کی بات ہے کہ صنعت کار، ترقی کے فائدے اپنے ہی خاندانوں تک محدود رکھنے کی کوشش کررہے ہیں!"

یہ الفاظ کسی تخریب پسند، حزب اختلاف کے کسی کارکن، کسی غیر ملکی ایجنٹ اور کسی ففتھ کالمسٹ نے نہیں کہے۔ بلکہ خود صدر ایوب نے کہے ہیں اور اگر انتظامیہ کے رجعت پسند عناصر یا نوکرشاہی ذہنیت رکھنے والے افراد کو ان الفاظ میں کوئی ایسی ویسی بات نظر آرہی ہے تو انھیں چاہیئے کہ وہ جلد از جلد صدر ایوب سے ہی جواب طلب کریں۔ کیونکہ یہ ایسی ویسی باتیں کرنے والا اگر کوئی ہے تو یہ صدر مملکت موصوف بذات خود ہی ہیں۔!

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے صدر مملکت کو افسوس کیوں کرنا پڑا؟ ایسی صورتحال پیدا ہی کیوں ہوئی؟ کیا ان قابل افسوس حالات کا سبب کوئی غیبی یا ان جانی مافوق الفطرت ہستی ہے یا یہ سب کچھ ہونی شدنی بات ہے یا یہ صورت حال ازل سے ابد تک رہنی ہے یا اس کو بدلنا اور ختم کرنا ہمارے اپنے قبضۂ قدرت میں نہیں ہے۔ آخر معلوم تو ہو کہ یہ کیا بات ہے جو آج ہمیں افسوس کرنا پڑ رہا ہے اور ممکن ہے کہ آنے والے کل میں ہیں رونا اور آنے والے پرسوں میں ہمیں مرنا پڑے۔؟

بات بالکل صاف آسان اور عام فہم ہے کہ ایسا سب کچھ صرف اور صرف سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ہوا کرتا ہے۔ وہاں جہاں ہر "قدر" — "زر" کے پیمانے پر تولی جاتی ہے — جس میں "سونا" — "انسان" پر فوقیت رکھتا ہے — وہ نظام جس میں "مٹھی بھر چند افراد" — کی خوشحالی اور مسرتوں کی روح فرسا داستانِ طویل — "کروڑوں انسانوں کی اکثریت" کے — خون سے تحریر کیجاتی ہے، وہاں یہ بھی ہوا ہے، یہ ہی ہو رہا ہے اور یہ ہی ہوگا! یہ باتیں "تلخ" سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ "صداقت" کا درجہ رکھتی ہے۔

بھولے بھالے عوام کو حسین وعدوں سے بہلانا، ہمارے بدنصیب وطن میں کوئی نئی بات نہیں — یہ بڑا پرانا کاروبار ہے، جو سیاسی آزادی کی صبح طلوع ہونے کے بعد سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا؟ ہم، سے کہا تو یہی جاتا رہا ہے کہ "یہ ملک آپ کا ہے" — "اس کے مالک آپ ہیں" — "اس کی دولت آپ کی ہے" — اس کو سنوارنا آپ کا کام ہے" — لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ یہ ملک چند برگزیدہ بندوں اور خاندانوں کی جاگیر بنا دیا گیا — جس کے اصل مالک بھی وہی تھے — اور جنکی دولت بے بہا بھی انھیں کی تھی۔ اور جنھوں نے اس وطن پاک — میں بسنے والے، وعدہ سے بہلنے والے — عوام کے خون کو اشرفیوں میں تبدیل کر کر کے اپنی بے ڈول اور بھدی تجوریوں کو خوب خوب سنوارا — کہ تجوری کا حسن بھی تو سونے سے ہی بڑھا کرتا ہے — اور رہ گئے عوام — انکی جو گت بنی، وہ ہم سے کسی کی نظر سے، خواہ وہ صدر ایوب کی ہو یا فقیر یعقوب کی — پوشیدہ نہیں۔!

"فلاحی مملکت" کے تصور کو نعرے کے طور پر استعمال کرنا اور بات ہے اور اسکو ملک کے معاشی ڈھانچے کا نمونہ قرار دے کر عملاً اپنانا دوسری بات،۔ "فلاحی مملکت" کے قیام کی نام نہاد کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ جو اعلانات کئے گئے ہیں وہ ہماری عملی حکمت عملی کے قطعی برعکس ہیں۔ صدر ایوب کہتے ہیں کہ۔

"حکومت قومی دولت کو چند ہاتھوں میں نہیں رہنے دیگی"۔ —

"روزمرہ کے استعمال کی اشیاء کی قیمتیں کم ہونی چاہئیں"۔ —

"سرکاری پالیسی کی بنیاد یہی ہے کہ عام لوگوں کو سہولتیں میسر آئیں"

"قومی وسائل مجموعی طور پر قوم کے ہیں اور انکی منصفانہ تقسیم عمل میں آئے گی" — لیکن وزارت صنعت کے ایک سیکریٹری یہ کہتے ہیں کہ

"تیسرے پنجسالہ منصوبے میں بھاری صنعتیں نجی سرمایہ سے قائم کیجائینگی۔"

ذہن حیران ہے اور آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں کہ آخر ان دو ذمہ دار افراد کے متضاد بیانات میں قدر مشترک کون سی ہے اور کہاں ہے۔ اور پھر ان بیانات کو بھی جانے دیجئے۔ بھلا کون نہیں جانتا کہ ایک "فلاحی مملکت" — میں اشیاء صرف کی قیمتیں اس طرح نہیں چڑھتیں جیسے کہ ہمارے وطن میں چڑھی ہیں — ساتھ ہی ساتھ صنعت، بنک، انشورنس، زمین، تجارت اور دوسرے تمام ملکی ذرائع پیداوار پر گنے چنے ۲۲ خاندانوں کا قبضہ — اجارہ داریوں کی ہمت افزائی — وہ عملی کارگزاریاں ہیں جو "مملکت" کی "فلاح" کے سلسلے میں حکومت کے اب تک کے تمام اعلانات کی اصلیت کا بھانڈا پھوڑتی ہیں۔ صاف صاف بات تو یہ ہے کہ "نجی ملکیت" — کی موجودگی اور سرپرستی میں "فلاحی مملکت" کا قیام مشکل نہیں بلکہ قطعی ناممکن ہے بھلا "منافع" — اور "فلاح" — کبھی یکجا ہوئے ہیں۔ انفرادی ملکیت کی تو بنیاد ہی اس اصول پر قائم ہے کہ لوٹ کھسوٹ کی مکمل آزادی ہو اور فلاح و بہبود کا قطعی ذکر نہ ہو — اور یہ ذکر ہو بھی تو کچھ اس طرح کہ لوٹ کھسوٹ کے مقصد میں ڈھال کا کام دے۔

اگر حکومت فلاحی نظام قائم کرنے کی واقعی خواہش مند ہے تو اسے گنتی کے چند افراد سے اپنا ناطہ توڑ کر — دس کروڑ افراد پر — عوام پر — اعتماد کرنا ہوگا اور فلاحی مملکت قائم کرنے کے لئے عملاً:

زمینوں کو کسانوں میں تقسیم کرنا ہوگا
صنعت کو قومی ملکیت میں لینا ہوگا۔
مزدوروں کو مطمئن کرنا اور
سرمایہ داروں کو دھتکارنا ہوگا۔
سامراج سے رشتہ توڑنا ہوگا
شہری آزادیوں کو بحال کرنا ہوگا
اجارہ داریوں کو ختم کرنا ہوگا۔
روزگار، تعلیم، علاج، رہائش
اور تفریح کا عام انتظام کرنا ہوگا۔
ملکی معیشت کو سوشلسٹ خطوط پر
ترتیب دینا ہوگا۔

ہم نے دیکھا ہے کہ عام طور پر ان تمام معروضات کے جواب میں سرکاری کارندے یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہاں بھئی یہ بھی ہوگا وہ بھی ہوگا۔ سب کچھ آہستہ آہستہ ہی تو ہوگا۔ ہمارے پاس جادو کا ڈنڈا یا الٰہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ یہ سب کچھ ایک دم آنکھ جھپکتے ہی فراہم کر دیا جائے — اور عام لوگ ان جملوں کی تاثیر سے متاثر ہو کر سر ہلانا اور ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر ہماری نظر میں حکومت کے کارندوں اور عام لوگوں کا یہ طرز عمل بالکل غلط ہے۔ ہمیں یہ کہنا ہے کہ ہم نے بھی بچپن میں الٰہ دین کا چراغ والی کہانی پڑھی ہے اور ہمیں اب بھی اچھی طرح الٰہ دین کی یہ کہانی یاد ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ الٰہ دین کا یہ چراغ صرف داستان کا ایک پرکشش اور فرضی چراغ نہیں تھا۔ بلکہ الٰہ دین کا یہ چراغ دیو مالائی اور جن بھوتوں کے قصہ کہانیوں سے الگ آج بھی — اب بھی — اپنا ایک اصلی، مادی اور حقیقی وجود رکھتا ہے — اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ الٰہ دین کے اس چراغ کو کس نے — کس طرح چرایا ہے ہم آج برملا یہ کہتے ہیں کہ "یہ چراغ" — ذرائع پیداوار" — کے روپ میں اب بھی موجود ہے۔ جو منافع خور جھوٹے چچاؤں نے پاکستان کے دس کروڑ الٰہ دینو کو بے ہوش کر کر کے اور بہلا دے دے کر ہتھیا رکھا ہے — "ذرائع پیداوار" کے اسی "چراغ" کو گھس گھس کر وہ چشم زدن میں اب بھی آنکھیں چندھیا دینے والے معجزات اور انہونے کرتب دکھاتے رہتے ہیں۔ جس طرح کہانی کا یہ چراغ اس الٰہ دین کا تھا اسی طرح آج کے سارے ذرائع پیداوار بھی آج کے الٰہ دینوں — عوام — کے ہیں جس طرح الٰہ دین کا یہ چراغ کہانی کے جھوٹے چچا نما جادوگر نے ہتھیا لیا تھا۔ اسی طرح یہ ذرائع پیداوار بھی آج کے جھوٹے چچا نما جادوگروں — سرمایہ داروں جاگیرداروں، مفت خوروں، کاہلوں اور انسانوں کی پیٹھ میں بوجھ بن جانے والے قابل نفرت انسان نما حیوانوں نے ہتھیا لئے ہیں — اور جس طرح الٰہ دین نے یہ چراغ اس جادوگر سے واپس چھین لیا تھا — اسی طرح یہ ذرائع پیداوار — غاصبوں کے ہاتھوں سے عوام چھین لیں گے۔ اور پھر وہ خود بھی اپنی مرضی سے اپنی مرضی کی زندگی گزاریں گے۔ اس سلسلے میں جلد یا بدیر کی فکر و تشویش لاحق نہیں ہے۔ بلکہ اطمینان اور یقین تو ایک ہونی اور اٹل حقیقت کا ہے جو آج نہیں تو کل پوری ہو کر رہے گی —

ہمیں صدر مملکت سے بھی یہی کہنا ہے کہ جہاں تک انتخابی مہم میں جیتنے کا اور حکومت کرنے کا تعلق ہے تو جیتنے اور ہارنے والے جیتتے اور اہل و نااہل حکومت کرتے ہی رہتے ہیں لہٰذا ان دونوں پہلوؤں سے قطع نظر کرتے ہوئے توجہ اصل مسئلہ کی طرف مبذول کرنی چاہئیے۔ اگر انھیں عوام الناس کے "دلوں" کو بھی جیتنا اور — "فلاحی مملکت کے وعدہ کو بھی نبھانا ہے تو انھیں یقینی طور پر "ذرائع پیداوار کے چراغ" کو مٹھی بھر سرمایہ دار، جاگیردار اور لٹیرے جادوگروں کے ہاتھوں سے چھین کر پاکستان کے دس کروڑ الٰہ دینوں کے ہاتھوں میں دینے کی حمایت کرنی ہوگی اور خود بھی عملاً ان کا ہی ساتھ دینا اور ہاتھ بٹانا ہوگا!

ورنہ الٰہ دین کی کامیابی اور جادوگر کی ناکامی کی رزمیہ کہانی تو موصوف نے بچپن میں خود بھی پڑھی ہوگی۔ یہ کہانی اتنی دلچسپ اور ناقابل فراموش ہے کہ انہیں ابھی تک یقیناً یاد ہوگی —!

اٹھارویں صدی

کے ایک کسان کا تصور کرو جو اپنی زمین پر جان دیتا تھا، وہ اپنا تمام اندوختہ اس زمین کی خریداری پر صرف کر دیتا تھا۔ اس زمین کے حصول کیلئے اس کو سب سے پہلے ایک محصول ادا کرنا پڑتا تھا بالآخر وہ یہ زمین حاصل کر لیتا تھا اور تخم ریزی کے وقت وہ ہر ہر دانے کے ساتھ اپنا دل بھی دباتا جاتا تھا۔ لیکن یہ پڑوسی اس کو چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ اور اس کو پھر اپنے کھیت کی ان چھوٹی چھوٹی نالیوں سے جن میں اس نے ہل چلا کر بیج ڈالے تھے، بلا لیتے تھے، وہ اپنے کھیت کے نونہالوں کو انکی چالوں سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی ایک نہ چلتی تھی جب وہ دریا پار کر کے آگے نکلنا چاہتا یہ اس کو روک کر اترائی کا محصول طلب کرتے، وہ اپنا سامان لے کر بازار جاتا تو یہ اس کو وہاں بھی ملتے۔ اور اس کو بیچنے کا اختیار، خریدنے کیلئے ان کو پھر محصول ادا کرنا پڑتا۔ اور جب وہ بازار سے لوٹتا اور بچا کھچا ہوا گیہوں استعمال کرنا چاہتا تو اس کو پھر اپنی مجبوری راستے کا پتھر معلوم ہوتی وہ یہ گیہوں جب تک انھیں محصول لینے والوں کی چکیاں نہ پیس لیتیں اور ان کے تنور اسکی روٹیاں پکا کر اس سے محصول وصول نہ کر لیتے، اپنے ہونٹوں کے قریب لے جانے کا حقدار نہ تھا۔ وہ اپنی چھوٹی سی آمدنی کا ایک حصہ ان پڑوسیوں کو صرف اس غرض سے کہ وہ اس کو بیگار سے معاف رکھیں ادا کرتا رہتا تھا۔ جہاں کہیں وہ جاتا ہے یہ تکلیف دہ پڑوسی اس کو راستہ روکے ہوئے کھڑے ملتے۔ جب یہ ہٹ جاتے ہیں تو کلیسا کا پادری کالا چغہ اوڑھے ہوئے اس کے کھلیان کا قیمتی نفع بٹانے آ موجود ہوتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے اداروں کے ایک حصہ کی تباہی کے بعد جو حصہ بچ رہا ہے وہ اس سے ہزار گنا زیادہ قابل نفرت حصہ ہے" —

ڈی ٹاکے وائل

مارکو پولو



صحرا بہ صحرا کو بہ کو



ویٹ نام ایک ایشیائی ملک ہے۔ جو آجکل تیسری عالمگیر جنگ سے نفرت اور محبت کرنے والے امن پرستوں اور جنگ پسندوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

امریکہ ویٹ نام کی جنگ آزادی میں قدم بہ قدم کچھ اس طرح دھنستا اور ملوث ہوتا جارہا ہے کہ اب اس کے لئے بخیر وخوبی اس دلدل سے نکلنا مشکل ہوگیا ہے ایک طرف تو امریکہ کے برسر اقتدار گروہ نے شمالی ویٹ نام پر حملوں کا سلسلہ بند کرنے سے قطعی انکار کردیا ہے اور دوسری طرف شمالی ویت نام کی بحری ناکہ بندی کا بھی فیصلہ کرلیا ہے ان اقدامات کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ ویت نام میں ہنگامی حالات برقرار رکھے جائیں تاکہ امریکی جنگ باز جنوبی ویت نام میں اپنی عبرت ناک شکست سے جتنی مدت تک بچ سکیں — بچیں، حالانکہ یہ تو خود امریکی بھی سمجھتے اور جانتے ہیں کہ بہرحال ان سب باتوں کے بعد بھی انھیں حاصل کیا ہونا ہے؟ — جدوجہد آزادی کبھی ناکام نہیں ہوئی — بلکہ ناکام ہمیشہ وہ ہی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے آزادی کے پروانوں کو ظلم وجور کی آگ میں جلایا ہے!

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد مشرق بعید کے ایک جغرافیائی حصے — انڈوچائنا پر ایک یورپی ملک — فرانس — حکومت کرتا تھا۔ اس غیر ملکی حکومت کے خلاف وہاں کے قوم پرستوں نے اپنی آزادی وخودمختاری کیلئے میدان جنگ میں کود پڑے تھے اور انھوں نے اپنی ہتھیلیوں پر سر رکھ کر فرانسیسیوں کو — "ڈین بین پھو" کے مورچے پر اس قدر مارا تھا کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے تھے، ایک معاہدہ کے ذریعے یہ طے پایا کہ انڈوچائنا کو چار حصوں میں تقسیم کردیا جائے۔ کمبوڈیا، لاؤس، شمالی ویت نام، جنوبی ویت نام، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی طے پایا کہ کسی حصّے کو دوسرے حصے میں مداخلت کا حق نہ ہوگا — کسی بیرونی فوج کو، کسی تقسیم شدہ حصے میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ہوگی ویت نام کے شمالی اور جنوبی حصوں کے متعلق یہ طے کیا گیا کہ یہاں رائے شماری کی جائیگی اور ان دونوں حصوں کو متحد کرکے ایک ویت نام کردیا جائے گا۔ ان فیصلوں کے بعد ہر چہار حصوں میں الگ الگ حکومتیں قائم ہوگئیں۔ کمبوڈیا نے ساری غیر ملکی فوجوں کو نکال کر الگ غیر جانبدارانہ اور آزاد حکومت قائم کرلی۔ لاؤس میں خانہ جنگی جاری رہی۔ شمالی ویت نام غربی اثر ونفوذ سے پاک اور ملکی استحکام وقومی بہتری کے راستے پر گامزن ہوگیا۔ لیکن جنوبی ویٹ نام کے حکمران، سامراجیوں کے پٹھو بنے رہے اور یہاں آہستہ آہستہ فرانس کے بدلے ایک دوسری ظالم قوت — امریکہ نے اپنے پیر جمالئے۔ اور یہاں کی دولت لوٹنے اور جنتا کو قتل کرنے کا کھیل کھیلنا شروع کردیا۔ تو جنوبی ویت نام کے حریت پسندوں نے ان غاصبوں اور قاتلوں کے خلاف اعلان جہاد کردیا — امریکیوں نے اپنے صحیح ترین ایجنٹوں کی تلاش کرنی شروع کردی اور ایک ایک کا انتخاب کرکے انھوں نے حکومت کی دگا میں مختلف افراد کو دینی شروع کیں — اس انتخاب اور تلاش کے سلسلے میں انھوں نے انتہائی غیر جمہوری انداز میں نہ جانے کتنی دفعہ جنوبی ویت نام کی حکومتوں کو تبدیل کیا۔ محلاتی انقلاب برپا کئے اور قتل وغارتگری کا مشغلہ کچھ اس طرح اور اس حد تک بڑھا کہ ڈیم اور

امریکی حملہ آور:- پیر تو پھنس گیا- اب گردن بھی گرفت میں آگئی تو کیا ہوگا-



کھان جیسے نکموار بھی راستے سے ہٹا دیئے گئے - اور اب یہاں کھاک سوبرا جان ہیں جن کی موجودگی میں ہزار ہا فوجیوں اور جدید ترین ہتھیاروں پر مشتمل، دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت ہونے کا دعویٰ کرنے والے ان لٹیروں اور بزدلوں کو ویٹ نام کے عوام نے چھٹی کا دودھ یاد دلا دیا ہے - جنگ و بربادی کے عادی اپنی مسلسل شکستوں سے تلملا کر اب براہ راست حملے کرنے پر اتر آئے ہیں - پہلے تو انھوں نے خلیج ٹونکن میں امریکی بحری جہازوں پر شمالی ویت نام کی آبدوز کشتیوں کے حملے کا بہانہ کر کے شمالی ویت نام پر بمباری کی تھی ــــ اور عالمی امن کو زیر و زبر کر ڈالنے کی سازش کی تھی - خدا خدا کر کے وہ بات آئی گئی ہوگئی - تو اب انھوں نے جنوبی ویت نام کے چھاپہ ماروں کی عملی امداد کرنے کا الزام لگا کر شمالی ویت نام پر وحشیانہ فضائی حملوں کا کبھی نہ رکنے والا سلسلہ شروع کر دیا ہے - امریکی شاید یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح "جنوبی ویت نام کے محاذ آزادی" کے مجاہدین اپنے ہتھیار رکھ کر امریکہ سے رحم اور صلح کی بھیک مانگ لیں گے - لیکن دو ماہ کی بمباری کے باوجود نہ تو ابھی تک جنوبی ویت نامیوں کی ثابت قدمی میں کوئی فرق آیا ہے اور نہ ہی شمالی ویت نامیوں کے جیالے رہنماؤں نے امریکہ کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں - بلکہ دونوں حصوں کے عوام انتہائی بہادری اور مثالی خود اعتمادی کے ساتھ امریکیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں - ان کے جہازوں کو نشانہ بنا رہے ہیں اور انکے ہزار ہا ڈالروں، کھوکھلے منصوبوں، اور جنگ پسند سورماؤں کو خاک میں ملا رہے ہیں -



امریکہ کی فوجی پالیسی مرتب کرنے والے "سکندروں" نے اپنی کھلی ہوئی شکست کا اندازہ کر لیا ہے - ان کے "فارمولے" کتنے غلط نکلے ؟ اس کا احساس اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ آخر ویت نام اور امریکہ کا مقابلہ ہی کیا - مگر جذبۂ آزادی ہے کہ نہ تو کچلا جا سکتا ہے اور نہ ہی فنا ہو سکتا ہے !

چند بے حس، بے وقعت اور بے ضمیر ممالک کو چھوڑ کر تقریباً تمام ملک امریکہ کی اس جنگ بازانہ اور جارحانہ کارروائیوں کی مذمت کر چکے ہیں - ان ممالک کی اس مذمت میں عوام اور حکومتیں دونوں ہی شامل ہیں - اور جہاں جہاں حکومت نے امریکی رویہ کی مخالفت نہیں کی وہاں وہاں عوام نے زبردست مظاہرے کر کر کے اپنی حکومت اور امریکی سامراج کی اختیار کردہ پالیسیوں کی قلعی کھول دی ہے - حد تو یہ ہے کہ امریکہ کے امن پسند اور جنگ کی ہلاکت آفرینیوں سے آگاہ شہری بھی یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ جنوبی ویٹ نام کا جنگی نہیں بلکہ پرامن حل تلاش کیا جائے - امریکہ کے دم چھلے برطانیہ کی نام نہاد دلیر حکومت تو ناک رگڑنے اور کورنش بجالانے کی ذلت آمیز حدوں سے بھی آگے نکل گئی ہے - لیکن برطانوی عوام، امریکی عوام کی طرح جنگی اقدامات کی مذمت کر رہے ہیں اور تو اور برسوں کے یار غار فرانس بھی اب زیادہ ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ــــ اس نے اب اپنی مخالفت اور واضح و شدید انداز میں شروع کر دی ہے ــــ فرانس نے سیٹو کی وزارتی کونسل کے ہونے والے اجلاس میں باقاعدہ نمائندے کی بجائے محض ایک معمولی مبصر بھیجنے کا اعلان کر کے ابھی سے امن دشمن معاہدے کے تحت کئے جانے والے ان تمام فیصلوں سے علیحدگی اختیار کر لی ہے جو ویت نام کی مذکورہ جنگ کے بارے میں کئے جائیں گے - یہ ہے امریکہ کی پالیسیوں کا دیوالیہ پن کہ اب وہ تنہا دنیا بھر کی رائے عامہ کا نشانہ بنا ہوا ہے - لیکن اس کے باوجود اپنی ناعاقبت اندیشی اور ہٹ دھرمی سے باز نہیں آتا -

امریکہ کے شکست خوردہ فوجیوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ جنوبی ویت نام کے چھاپہ ماروں کو شمالی ویت نام سے امداد مل رہی ہے ــــ یہ اپنا اناڑی پن تو تسلیم، کرتے نہیں کہ گوریلا جنگ میں وہ مقامی حریت پسندوں کو ہرانے کی صلاحیت نہیں رکھتے - پھر بھی دنیا کو دھوکہ دینے اور شمالی ویٹ نام پر حملہ کرنے کا بہانہ تلاش کرنے کے لئے انھوں نے الٹی سیدھی باتیں ہانکنا اپنا شیوہ بنا لیا ہے - حالانکہ خود امریکی اخبارات اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ محاذ آزادی، جنوبی ویت نام کی ہی ایک حریت پرست تنظیم و تحریک ہے جسے مقامی لوگوں کی مکمل اور عملی اعانت حاصل ہے - جہاں تک ہتھیاروں کا سوال ہے تو انھیں خود امریکہ مہیا کرتا رہتا ہے ــــ وہ ہتھیار جنھیں امریکی سپاہی، جنوبی ویت نامیوں کو مارنے کے لئے استعمال کرتے اور لاتے ہیں - انھیں جنوبی ویت نامی چھین کر، انکا رخ، انھیں دشمنوں کی طرف پھیر دیتے ہیں ــــ شاید اس صورتحال سے تنگ آ کر امریکی درندوں نے زہریلی گیس پھینکنے اور جراثیم کے بم گرانے کے تجربے بھی شروع کر دیئے ہیں ــــ اس گیس اور بموں سے عملاً جنگ میں حصہ لینے والے ہی نہیں بلکہ نہتے جنوبی ویت نامی بھی موت کا نشانہ بن رہے ہیں ــ لیکن اس طرح بھی جتنی مرنے والوں کی تعداد ہوتی ہے اتنی ہی تعداد میں جنوبی ویت نام کے متعلقہ خاندان محاذ آزادی میں شامل ہو کر امریکہ کے خلاف صف آرا ہو جاتے ہیں - !

امریکی صدر جانسن نے ہٹلر کی جنگی حکمت عملیوں کو اپنانا شروع کر دیا ہے کہ بیک وقت مختلف محاذوں پر باقاعدہ لڑائی شروع کر دی جائے - ظاہر ہے کہ ان ہی حکمت عملیوں کی وجہ سے جرمنی نے مغربی ممالک کے ساتھ سوویت یونین پر بھی اچانک حملہ کرنا صحیح قرار دیا تھا ــــ اور پھر انجام تو معلوم ہی ہے کہ مغربی اقوام اور سوویت یونین جو کہ خود ایک دوسرے کے دشمن تھے ــــ متحد ہو کر ہٹلر پر پل پڑے اور اب تاریخ یہ بتانے سے بھی قاصر ہے کہ ہٹلر نے خودکشی کی یا اسکی کسی داشتہ نے اسے زہر دے دیا یا وہ کسی فوجی کی نوکیلی سنگین یا کسی بندوق کا بہترین نشانہ بن گیا - بالکل

امریکہ کی جنگی سرگرمیوں کی کہانی

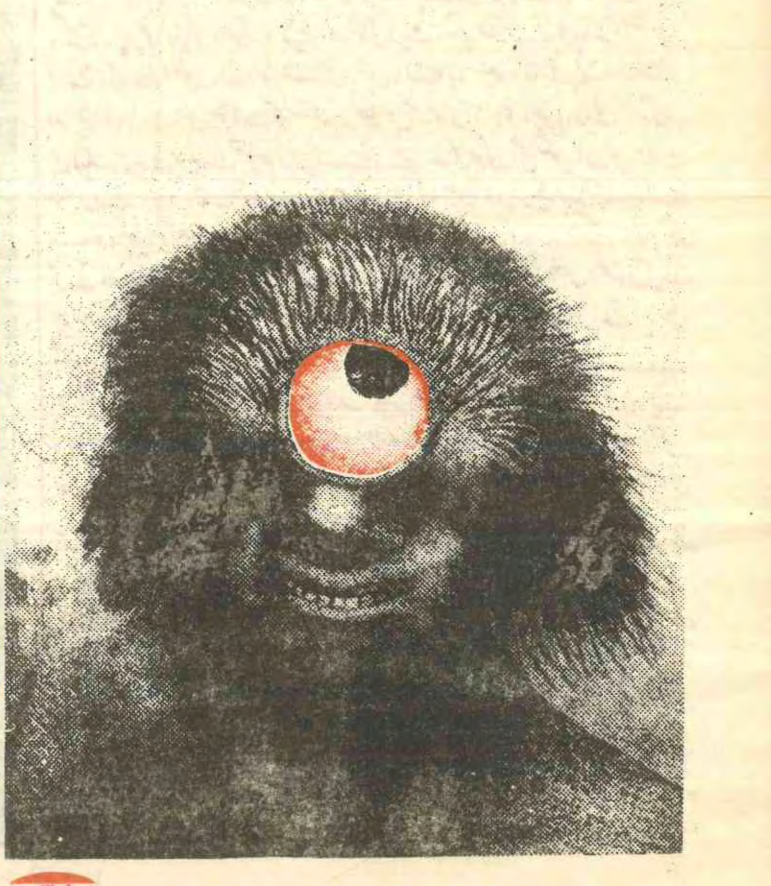
زھریلے جراثیم کی زبانی



۴: ۔ جنوبی ویت نام کے محاذ آزادی کو گفت وشنید میں شامل نہ کیا جائیگا۔ بین الاقوامی غنڈہ گردی، دھاندلی اور لوٹ کھسوٹ کے غیر اصولی اصول پر مبنی اس "غیر مشروط" مگر "مشروط" گفت وشنید کا جائزہ لیا جائے تو یہ نظر آئیگا کہ:

۱:۔ اس غیر مشروط پیشکش کی اولین شرط ۔۔۔ امریکی فوجوں اور اڈوں کا جنوبی ویت نام سے نہ ہٹایا جانا ہے ۔ جبکہ ۵۴ء کے معاہدہ جنیوا کے تحت ویت نام میں نہ تو غیر ملکی فوجیں رکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہی غیر ملکی فوجی اڈے قائم کئے جا سکتے ہیں ۔

سامراجی درندہ ۔ جانسن ۔ اپنے اصلی روپ میں



۲:۔ دوسری شرط جنوبی ویت نام کی کٹھ پتلی حکومت کے متعلق ہے جو، امریکہ کے نکتہ نظر کے مطابق ایک "آزاد" اور "جمہوری" حکومت ہے ۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک وہاں کسی قسم کے کوئی انتخابات نہیں ہوئے ۔ بلکہ، امریکہ کی جنبش چشم پر ایک کے بعد دوسری حکومتیں بدلتی رہتی ہیں اور معاہدہ جنیوا کے تحت ۵۶ء میں اس ملک میں انتخابات کے ذریعے جنوبی اور شمالی ویت نام کے دونوں حصوں کو متحد کیا جانا طے پا چکا تھا ۔۔۔ لیکن کیونکہ یہ موری کے کیڑے جانتے ہیں کہ ویت نامی عوام ان انتخابات میں یقیناً ان کے تخت الٹ اور تاج اچھال دیں گے ۔ اس نئے انتخاب اور اس اتحاد کو ۔۔۔ مذکورہ جنگی سرگرمیوں سے ٹالا جا رہا ہے ۔

۳:۔ تیسری شرط یہ ہے کہ محاذ آزادی سے گفت وشنید کیلئے امریکہ تیار نہیں ہے حالانکہ اصل جنگ ہی جنوبی ویت نام کی زمین پر لڑی جا رہی ہے ۔۔۔ جسے ویت نامی عوام "محاذ آزادی کے جھنڈے تلے لڑ رہے ہیں پھر اس سے بات چیت سے انکار کے معنی یہ ہیں کہ امریکہ بات چیت کرنے کا خواہش مند ہی نہیں ہے ۔ اس "غیر مشروط" مگر "مشروط" پیشکش کے ساتھ ساتھ جانسن نے ایک بلین ڈالر کی رشوت بھی پیش کی ۔۔۔ اور وہ بھی جنگ آزادی کے مجاہدوں کو ۔۔۔ جو اپنی جان پر کھیلنا تو جانتے ہیں مگر جانسن صاحب کے سونے چاندی کے بدلے بکنا نہیں جانتے ۔ ! اور یہ "رویہ بھی امریکہ نے اسوقت اختیار کیا ہے جبکہ اس نے دیکھ لیا کہ کوئی بھی سر جھکانے کے لئے تیار نہیں ہے اور اگر دیکھا جائے تو یہ پیشکش بھی ایک طرح سے جانسن کی اپنی حکمت عملیوں کی ناکامی کا اعتراف ہے کیونکہ اس سے پہلے تو امریکی حکومت کسی بھی "قسم" کی گفت وشنید کے لئے تیار ہی نہ تھی اور صرف ڈنڈے کے زور سے باتیں منوانا چاہتی تھی ۔ مگر اب نہ تو یہ "ڈنڈا" کامیاب ہو رہا ہے اور نہ ہی یہ پیشکش قبول کی جا رہی ہے ۔ بلکہ معصوم بچے اپنی جان قربان کر کے سیگاؤں میں واقع امریکی سفارتخانے کو آزادی کے شعلوں اور خودمختاری کے دھماکوں کی نذر کر رہے ہیں ! فوجی عدالتوں سے ملنے والی سزائے موت کے باوجود "ہوچی منہ زندہ باد" اور امریکی سامراج مردہ باد" کے نعرے لگا رہے ہیں ۔۔۔ مطلب یہ کہ شعلۂ حریت کبھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور نہ ہوگا ۔

امریکہ نے ایک ایک کر کے معاہدہ جنیوا کی تمام شرائط کو پیروں تلے روند کر اس بین الاقوامی معاہدے کی جس طرح دھجیاں بکھیری ہیں ۔ وہ اس بات کا بدیہی ثبوت ہے کہ امریکہ طاقت کے نشے کو کسی معاہدے کا پابند سمجھتا ہے اور نہ ہی بین الاقوامی اصولوں کو ماننے پر تیار ہے ۔ بلکہ اسکی تو صرف ایک ہی "رٹ" ہے کہ وہ "آزاد دنیا" کا محافظ و نگراں ہے ۔ کسی دل جلے کا یہ جملہ بڑا پیارا ہے کہ ۔۔۔ بین الاقوامی معاہدوں کا احترام کرنا تو کوئی امریکہ سے سیکھے ۔ یہی نہیں بلکہ منطق یہ بھی ہے کہ یہ تو صرف امریکہ کے مفادات کا تحفظ کیا جا رہا ہے اور ویسے تو ہم بھی امن پرست ہیں ۔۔۔ ہر چند ان مفادات کا ذکر بھی امریکی کبھی نہیں کرتے ۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ "مفادات" "لوٹ کھسوٹ کے سوا کچھ بھی نہیں ہیں ۔۔۔ اور امریکہ یہ بھی جانتا ہے کہ جس دن ویٹ نام سے اسے باہر نکلنا پڑا تو ایشیا سے ہی اسے اپنا بوریا بستر سنبھال کر بھاگنا پڑے گا اور پھر لوٹ کھسوٹ کے "مفادات" کی نگرانی ممکن نہ رہے گی ۔

اب صورتحال یہ ہے کہ ایک طرف تو شمالی ویت نام کے صدر، ہوچی منہ نے امریکی پیشکش کی شاطرانہ لپیٹ میں آنے سے صاف انکار کر دیا ہے اور کہدیا ہے کہ صرف ۵۴ء کے معاہدہ جنیوا کے اصولوں پر ہی بات ہو سکتی ہے ۔۔۔ دوسری طرف وہ سارا کمیونسٹ بلاک جو روس کی قیادت تسلیم کرتا ہے حرکت میں آنے پر مجبور کر دیا گیا ہے ۔ تیسری طرف عوامی جمہوریہ چین کی قومی کانگریس نے ایک قرارداد کے ذریعے امریکہ کے خلاف جنگ میں حصہ لینے کی پوری تیاری کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے ۔۔۔ چوتھی طرف اس دنیا میں بسنے والے تمام امن پسندوں نے امریکی سامراج سے ٹکر لینے کی ٹھان لی ہے ۔۔۔ اور اس پورے

یہ ہی کیفیت اس وقت بھی ہے ـــــ عوام الناس تو خیر امریکہ کے خلاف جا ہی رہے ہیں کہ اب تک کسی ملک کے عوام نے ویت نام میں امریکی اقدامات کے حق میں کوئی جلسہ جلوس نہیں کیا ـــــ لیکن مخالفت میں ہر روز کہیں نہ کہیں مظاہرے ہوتے رہتے ہیں ـــــ ساتھ ہی ساتھ جنوبی کوریا، اٹلی، برطانیہ اور اسی قسم کے کچھ اور ممالک کی چھوٹی حکومتوں کو چھوڑ کر مغربی ممالک کے ہی حکمران امریکی پالیسی کی باقاعدہ مخالفت کر رہے ہیں پھر روسی بھی "بقائے باہم" کے سلسلے میں اپنی خوش فہمیوں کے چکر سے نکل کر چینیوں کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں اور ویت نام کے عوام کی عملی ہمدردی کیلئے میدان میں اترنے کی ابتدائی تیاریاں کر رہے ہیں!

جانسن صاحب نے حال ہی میں ایک "غیر مشروط" گفت و شنید کی پیش کش کی تھی۔ اس جھوٹی اور منافقانہ پیش کش کو مغربی پریس نے خوب خوب اچھالا لیکن اسکی پول خود ایک مغربی اخبار "گارجین" نے ہی کھول کر رکھدی ـــ گارجین نے لکھا کہ "اس غیر مشروط پیشکش" میں بھی تین "شرائط ہیں۔

۱:- امریکی افواج جنوبی ویت نام سے نہیں ہٹائی جائیں گی۔

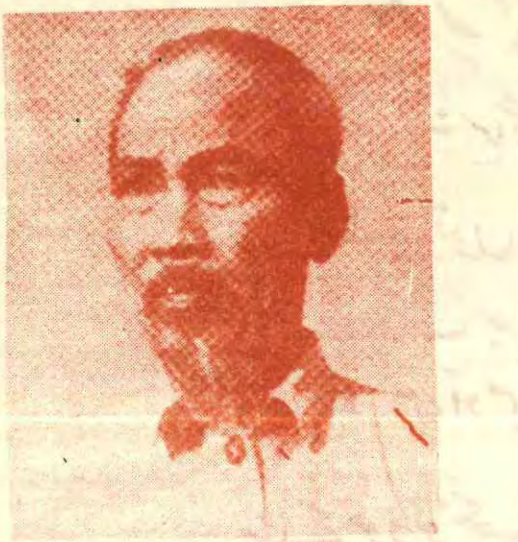
۲:- جنوبی ویت نام کی امریکہ نواز مگر غیر مقبول حکومت بدستور قائم رہے گی۔

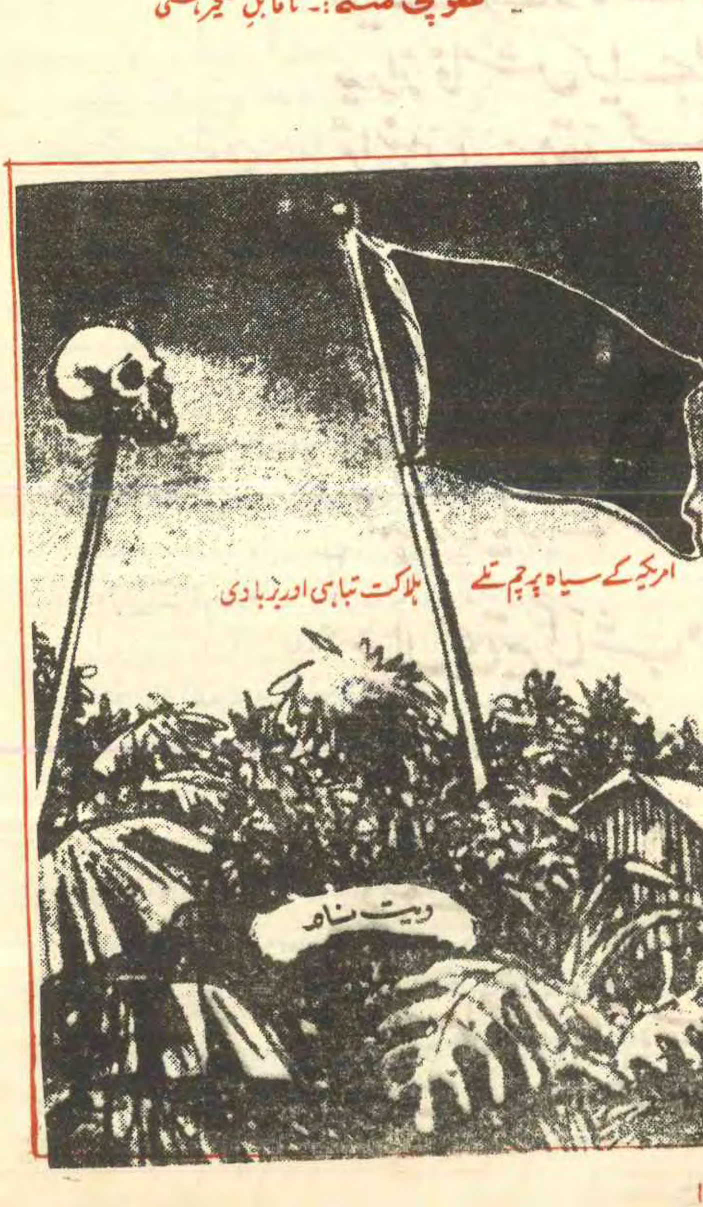
"چوکھٹے" میں امریکہ کے فوجی حکمرانوں کی "دائرہ" نما جنگ پسندی کی جارحانہ پالیسیاں مرتب ہو رہی ہیں۔ وحشیانہ سرگرمیاں جاری ہیں ـــــ اگر (یہ "اگر" بڑا اہم، توجہ طلب اور بر وقت ہے) کہیں جنگ کے دشمنوں کا یہ "چوکھٹا" سکڑنا شروع ہو گیا۔ امن کے دشمنوں کا یہ "دائرہ" پھیلنا شروع ہو گیا تو پھر کیا ہو گا ـــ تیسری عالمگیر جنگ ـــــ! دنیا کے نئے بٹوارے کی احمقانہ کوششیں ـــــ لازمی طور پر ایک اور عالمی جنگ کی شکل میں نمودار ہونگی

وہ لڑائی جو آج ویت نام پر تھوپی جا رہی ہے پھر ہر ملک، ہر قوم اور ہر انسان پر تھوپی جائیگی ـــــ پھر ایک ایک کی ٹانگ گھسیٹی جائے گی ـــ اور ـــ اور ـــ ایٹم بموں، راکٹوں، اسپٹنکوں، میزائیلوں، زہریلی گیسوں اور ملک الموت کا راج ہو گا ـــ لہٰذا آج ہمیں ـــ ہر انسان کو، ہر قوم کو ہر ملک کو ـــ ہر حکومت کو اور ہر تنظیم کو ـــ "عالمی امن" کا تحفظ کرنا پڑے گا۔ گیہوں کی بالیوں اور پہاڑوں کی برفپوش چوٹیوں، شعر و ادب کے انمول خزانوں اور دلکش وادیوں، معصوم بچوں اور حسین دوشیزاؤں، گبرو جوانوں اور ضعیف بندوں سائنس کی برکتوں اور فطرت کی نعمتوں ـــ انسانیت کے تمام تحفظوں کی، حفاظت کرنی ہوگی، عالمی جنگ برپا کرنے والے امریکی شیطانوں کے

وہ لمبے لمبے فوجی ہاتھ قلم کرنا ہونگے جو امریکہ سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ویت نام اور ویت نامیوں کو "موت کا زہر" پلا رہے ہیں۔ ہمیں یہ عہد کرنا ہو گا کہ:

وہ نظام، وہ دنیا
جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے
ایک دن مٹا دیں گے


ہوچی منہ :- ناقابلِ تسخیر ہستی



نکہت بریلوی

نذرِ شہیداں

مقام خاکِ شکاگو بلند ہے تیرا
ترے سپوتوں نے راہِ بقا دکھائی ہے
لہو سے رنگ بھرا ہے نگارِ ہستی میں
وقارِ عظمتِ آدم کی ضو بڑھائی ہے

مٹا کے خود کو نکھارا ہے زندگی کا جمال
دیا ہے مر کے زمانے کو درس جینے کا
یہ راز فاش کیا ہے بفیضِ عزم و یقیں
بُرا نہیں ہے مقدّر کسی سفینے کا!

سلام تم پہ شہیدانِ عظمتِ آدم!
سلام ارضِ شکاگو کے نیک فرزندو
تمہارے نام سے روشن رہیگی بزمِ حیات
تمہاری یاد سے ملتا ہے دم اجالوں کو

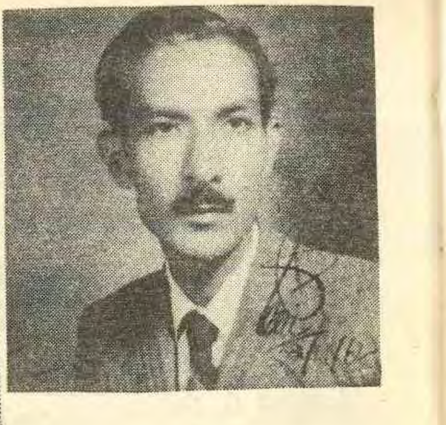
جہاں بھی تیرگیٔ شب قدم جمائے گی
تمہاری یاد کے دیپک جلائے جائینگے
نظامِ آتش و خوں سے مقابلے کے لئے
ڈبو کے خون میں پرچم اٹھائے جائینگے

سلام تم پہ شہیدانِ عظمتِ آدم!
سلام ارضِ شکاگو کے نیک فرزندو

یومِ مئی

ایک عظیم تحریک

طفیل عباس



یوم مئی مزدوروں کا بین الاقوامی دن ہے اس دن کا نام لیتے ہی مزدوروں کی وہ تمام تاریخ ذہن میں آجاتی ہے جو ریاستہائے متحدہ امریکہ میں فیکٹریوں کے قیام کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی یہ تاریخ ۱۸۸۶ء میں یومیہ اوقات کار کم کرانے کی عظیم جدوجہد کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے آج زمان و مکان کی ساری وسعتوں تک پھیل گئی ہے۔ اور اب مستقبل میں مزدوروں کی بین الاقوامی فتح پر ہی اس تاریخ کا آخری باب مرتب کیا جائے گا۔

دنیا کی پہلی باقاعدہ ٹریڈ یونین ـــــ فلاڈلفیا کے اندر ۱۸۲۷ء میں بن چکی تھی اور غیر معینہ اوقات کار کم کرا کے دس گھنٹے کا دن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا تھا ۱۸۳۴ء میں نیویارک کے بیکروں کی ہڑتال کے زمانے میں "ورکنگ مینز ایڈووکیٹ" نے بھی یہ لکھا تھا کہ:۔

"ڈبل روٹیوں کی صنعت میں ملازم ہم وطن سالہا سال
سے مصری غلاموں سے بدتر زندگی گزار رہے ہیں انہیں چوبیس
گھنٹوں میں سے اوسطاً اٹھارہ سے لیکر بیس گھنٹے تک
محنت مزدوری کرنی پڑتی ہے ـــــ!"

اوقات کار میں کمی کرانے کی جدوجہد کچھ امریکہ سے ہی مخصوص نہ تھی بلکہ دنیا بھر میں ہر اس جگہ جہاں آہستہ آہستہ سرمایہ محنت کا استحصال کرنا شروع کر رہا تھا یہ جدوجہد بھی برابر تیز ہوتی جا رہی تھی۔ دور دراز واقع آسٹریلیا تک میں:۔

"آٹھ گھنٹے محنت، آٹھ گھنٹے روزمرہ کے مشاغل، آٹھ گھنٹے نیند!"

کا نعرہ بلند کیا جا چکا تھا اور ۱۸۵۶ء میں یہ مانگ۔ پوری ہو چکی تھی لیکن امریکی مزدوروں کو کافی زمانہ تک چودہ سولہ، اور اٹھارہ گھنٹے محنت اور مشقت کرنی پڑتی جس کے نتیجے میں یومیہ اوقات کار میں کمی کرانے کی جدوجہد نے نسبتاً یہاں زیادہ شدت اختیار کی۔ یہ اور دوسرے مشترکہ مسائل کو تنظیمی شکل میں منوانے کے لئے ۲۰ اگست ۱۸۶۶ء میں امریکہ کی تمام مزدور تنظیموں کے نمائندے "بالٹی مور" کے مقام پر جمع ہوئے انھوں نے اپنی ایک متحدہ تنظیم "نیشنل یونین لیبر" کے نام سے قائم کر لی جب ذیل قرارداد اس تنظیم کے ہی ایک اجلاس میں منظور کی گئی۔

"محنت کشوں کو سرمایہ داری کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے اس
دور کا سب سے اول اور اہم ترین تقاضا یہی ہے کہ ایک ایسا
قانون پاس کرایا جائے جس کی رو سے امریکہ کی تمام ریاستوں
میں آٹھ گھنٹے کے دن کا تعین ہو ہم عہد کرتے ہیں کہ اپنی اس زریں"
مقصد کے حصول کے لئے ہم اپنی ساری طاقت لگا دیں گے۔

اس کانگریس کے بعد اسی سال ستمبر میں مزدوروں کی تحریک بین الاقوامی تنظیم کی جنیوا کانگریس نے بھی یہی مطالبہ رکھا کہ:۔

"محنت کے دن کی قانونی حد بندی بالکل ابتدائی شرط ہے جس کی
تکمیل کے بغیر محنت کش طبقے کی فلاح و بہبود کے لئے کی جانے والی
اور دوسری تمام کوششیں لاحاصل ثابت ہوں گی لہٰذا یہ کانگریس
تجویز کرتی ہے کہ محنت کے دن کی قانونی تخصیص کے لئے آٹھ گھنٹے
مقرر کر دیئے جائیں۔"

ایک سال بعد ہی ۱۸۶۷ء میں دورِ حاضر کے عظیم ترین انقلابی کارل مارکس نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" میں یومیہ اوقات کار میں کمی کی اس جدوجہد کے سیاسی پہلو کو اس طرح اجاگر کیا ہے:۔

"ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کسی قسم کی آزادانہ مزدور تحریک
اس وقت تک معطل رہی جب تک کہ جمہوریہ کے ایک حصے
سے غلامی غائب نہیں ہو گئی۔ جہاں کالی چمڑی والا مزدور جکڑا
ہوا ہو وہاں گوری چمڑی والا مزدور بھی اپنے آپ کو نہیں سنبھال
سکتا لیکن غلامی کی موت کے ساتھ ہی ایک نئی اور سخت زندگی
نے جنم لے لیا۔ آٹھ گھنٹے یومیہ کام کے لئے جدوجہد کا آغاز ہی خانہ
جنگی کا اولین ثمر تھا۔ ایک تحریک ابھری اور انتہائی تیز رفتاری
کے ساتھ بحر اوقیانوس سے لیکر بحر الکاہل اور نیو انگلینڈ سے لیکر
کیلیفورنیا تک پھیل گئی۔"

شاید محنت کشوں کے پختہ شعور کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ۱۸۷۵ء میں کارکنوں کی تنظیم اور متحدہ انجمن سے خوفزدہ ہو کر کانوں کے مالکوں نے اس انجمن کے دس سرگرم کارکنوں کو پھانسی دیکر شہید کرا دیا تھا۔ بہرحال ۱۸۷۷ء میں اس مطالبے کے لئے جدوجہد نے آہستہ آہستہ مکمل اور ہمہ گیر تحریک کا روپ دھار لیا۔ ریلوے اور فولاد کے کارخانوں کے لاکھوں مزدوروں کے ابھرتے ہوئے جذبات کو کچلنے کے لئے حکمرانوں اور سرمایہ داروں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر لیا اور انتہائی ظلم و جور کے بعد وقتی کامیابی حاصل

کرلی۔ کالے مزدوروں پر ظلم ڈھانے کے لئے پولیس اور فوج کی آمد نے مزدوروں کو یہ بات اچھی طرح سمجھادی کہ معاشرے میں انکی اپنی کیا حیثیت ہے۔ کون سے عناصر انکے دوست اور کون سے حلقے انکے دشمن ہیں۔ اس زمانے میں امریکی انتظامیہ نے جو منفی رویہ اختیار کیا اس کو دیکھتے ہوئے "آدم اسمتھ"، کے یہ الفاظ یاد آتے ہیں کہ

"جب مجلس قانون ساز کوشش کرتی ہے کہ مالکوں اور مزدوروں
کے فرق میں اعتدال پیدا کرے تو یہ حقیقت فوراً بے نقاب
ہو جاتی ہے کہ اس کے ارکان دراصل مالکوں کے طبقے سے ہی
تعلق رکھتے ہیں ——!"

۱۸۸۰–۹۰ء کی دہائی امریکی صنعت کی ترقی اور اندرونی تجارت کی وسعت کے لحاظ سے بڑی اہم اور قابل ذکر دہائی تھی لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں اندھا دھند منافع خوری کے ناعاقبت اندیشہ رجحان کی برکت سے ۱۸۷۳ء کے معاشی بحران کے بعد امریکہ کو ۱۸۸۴–۸۵ء میں معاشی بحران کے ایک اور زبردست چکر کا سامنا کرنا پڑا۔ جس نے ان کروروں مزدوروں کو روزی روزگار سے محروم کرڈالا۔ بے روزگار مزدوروں کی اس زبردست فوج نے مزدوروں کی تنظیمی اور معاشی جد و جہد کو مزید تقویت بخشی اور طبقاتی اعتبار سے پوری لڑائی ایک دوسرے دور میں داخل ہوگئی اس زمانے میں مزدوروں کے بگڑے ہوئے تیور ان کے آہنی عزائم کا پتہ دیتے ہیں خصوصاً شکاگو کے مزدور جو ۱۸۸۶ء کی پہلی ہڑتال کے موقع پر زیادہ موثر اور بپھرے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہاں مزدوروں کی قیادت نسبتاً بائیں بازو کے ترقی پسند رہنماؤں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس دن کی زبردست ہڑتال میں آٹھ گھنٹے کام کرنے کے متعلق پوری شدت کے ساتھ رکھا گیا۔ ظاہر ہے کہ مزدوروں کے اس جوش و جذبے سے خائف اور ان کے خون کے پیاسے سرمایہ دار ایسے وقت میں کیونکر چین سے بیٹھ سکتے تھے۔ لہذا انھوں نے انکی ہڑتال کو توڑنے اور جلسے درہم برہم کرنے کے لئے اصول بنائے جن پر مزدوروں نے غصے میں آکر ۳ مئی کو پھر جلوس نکالا۔ لیکن محنت کشوں کے دشمنوں نے ان پر ظالمانہ حملہ کرڈالا۔ زخمیوں اور ہلاک ہونے والے مظاہرین کی حمایت میں مزدوروں نے فطری طور پر ۴ مئی کو ایک اور جلوس کا پروگرام بنایا اور وہ سب مارکیٹ کے چوراہے پر بڑی تعداد میں جمع ہوئے یہ بالکل پرامن تھے مگر ظالموں کی پیاس ابھی نہیں بجھی تھی انہیں ابھی معصوم مزدوروں کا اور خون پینا تھا لہذا اس مرتبہ پھر پولیس اور فوج نے قاتلانہ حملہ کیا۔ سڑکیں، دیواریں، نالیاں محنت کشوں کے خون سے سرخ ہوگئیں ان کا اپنا —— پرچم —— مطالبات کا سفید پرچم —— کبھی ان کے خون سے لال ہوگیا۔

پہلی مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو کے ایک مزدور اخبار میں تاریخی بصیرت اور طبقاتی شعور رکھنے والے کسی صحافی کے یہ لافانی الفاظ چھپ چکے تھے:۔

"بہادری سے آگے بڑھے چلو!
لڑائی شروع ہوگئی ہے ——،
مزدوروں کی ایک بہت بڑی تعداد بیروزگار ہے۔ سرمایہ داری
کے خونی پنجے قانون اور بے جان امن کے کھوکھلے پردوں کے
پیچھے چھپے ہوئے ہیں ——!
محنت کشو!
تمہارا نعرہ اب یہ ہونا چاہئے۔ کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا
پہلی مئی کی تاریخی اہمیت تو آنے والے زمانے میں تسلیم کی جائے
گی۔ یہ تمہارے حقوق طلب کرنے کا دن ہے۔ یہ بات اچھی طرح
جان لو کہ سرمایہ دار بغیر لڑے ہوئے کام کے گھنٹے کبھی کم نہیں
کریں گے ——!"

امریکہ کے مزدوروں نے اپنا خون دیکر —— اس گمنام صحافی نے ان امر الفاظ کی لاج رکھ لی۔ اور واقعی یہ الفاظ زندہ جاوید ہیں۔ ان کا ایک ایک حرف تاریخ اور عمل کی کسوٹی پر پورا اتر چکا ہے۔

۴ مئی کے قتل عام کے بعد بھی زرداروں اور مل مالکوں کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور انھوں نے پھر پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع کردیا —— جو فشر، اینجل، اسپائیز اور پیرسنز —— محنت کشوں کے جیالے رہنماؤں کو پھانسی دیکر ختم کیا گیا ——

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

لیکن جب سے لیکر اب تک مزدور تحریک اس حقیقت کی شاہد ہے کہ یہ سلسلہ دار و رسن، اس کو ختم نہیں کرسکا۔ جب تو یہ شروع ہوا تھا اور اب بھی جاری ہے۔ پہلی مئی ۱۸۹۰ء میں اس پوری تحریک کا تجزیہ کرتے ہوئے فریڈرک اینجلز نے لکھا تھا کہ:۔

"اس وقت جبکہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، یورپ اور امریکہ
کے پرولتاری اپنی قوت کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یہ ایک پرچم
کے تلے، تاریخ میں پہلی دفعہ ایک فوج کی طرح منظم ہوتے ہیں
اور ایک فوری مقصد۔ آٹھ گھنٹے یومیہ کام کے لئے لڑ رہے ہیں"

یہ تھا "یوم مئی"، کی تحریک کا ایک مختصر سا تاریخی پس منظر۔ اس کے مطالعہ سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج دنیا بھر میں محنت کش طبقہ کے لئے اس تحریک کا سیاسی پہلو کس قدر زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دن اب علامت ہے ایک سیاسی، تنظیمی، طبقاتی اور نظریاتی اتحاد کا جو آج کل دنیا بھر کے محنت کشوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ سامراجیوں اور ان کے حواریوں نے ۱۸۸۶ء سے لیکر اب تک یہ ناپاک کوششیں کی ہیں کہ مزدوروں کے اس دن کا تاریخی تقدس ختم کردیا جائے کبھی اس دن کو تفریحی رنگ دینے کی ناپاک حرکتیں کی گئیں اور کبھی اس کو بچوں کے تحفظ کے لئے بین الاقوامی دن بنانے کی حماقتیں کی گئیں۔ بھلا مزدور اپنی قوت محنت کے پورے معاوضہ سے محروم مزدور کیا تفریح کرے گا —— اپنے بھوکے اور بیمار بچوں کی کیا حفاظت کرے گا۔ اس لئے بچوں کی حفاظت اور اس کی اپنی تفریح تو صرف اور صرف اسی دن ہوسکے گی۔ جس دن مئی تحریک کے شہیدوں کے الفاظ ساری دنیا کی حکومتوں کے سربراہوں کی زبانوں پر ہونگے اور ہر ملک کا دستور انہیں اپنی زینت بنائے ہوئے ہوگا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ مزدور دشمن سیاستدانوں کی وہ ساری ناپاک خواہشات، خاک میں ملادی گئیں جو کسی نہ کسی طرح اس بین الاقوامی دن کی اہمیت کو گھٹانے کے لئے قائم کی گئی تھیں۔ اور

اب اس دن دنیابھر کے مزدور، خواہ وہ کسی ٹریڈ یونین تحریک میں کام کرتے ہوں، یا اپنے محکوم و نیم محکوم دیس کو آزاد کرانے کے لئے میدان جنگ میں سر سے کفن باندھ کر اترتے ہوں، کسی اخبار میں کام کرتے ہوں یا بحری، بری اور فضائی نوعیت کے کسی بھی مشغلہ میں مصروف ہوں اپنے امریکی مزدور لیڈروں کے خون میں رنگے ہوئے سرخ پرچم کی قسم کھا کر یہ عہد کرتے ہیں کہ جب تک اس دھرتی سے انسان کے ہاتھوں انسان کی، قوم کے ہاتھوں قوم کی اور ملک کے ہاتھوں ملک کی لوٹ کھسوٹ ختم نہ ہو جائے گی۔ جب تک اس دنیا سے مزدور اور محنت کی دشمن سامراجی اور رجعت پرست طاقتیں نیست و نابود نہ کر دی جائے گی ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ سرمایہ دار دنیا میں بھی اس دن ہماری طرح کے مزدور اپنے یہاں کی عوام دشمن حکومتوں کا تختہ الٹنے کا عہد کرتی ہیں۔

لیکن اس عہد و پیمان کے ساتھ ساتھ یہ ستم ظریفی بھی مشاہدہ میں آتی ہے کہ امریکہ ——— جہاں کے مزدوروں نے سب سے پہلے آٹھ گھنٹے یومیہ کا مطالبہ منوانے کے لئے اپنا سر بلند کیا ——— اپنا سینہ تانا ——— اپنا خون بہایا ——— اور ساری دنیا کے مزدوروں کو ایک جھنڈا اور ایک سبق دیا ——— وہاں پر ہی آج ساری دنیا کے بدترین، سڑے ہوئے اور گھناؤنے ذہنوں کی حکمرانی ہے ——— ! امریکہ ——— جس کے مقبول ترین صدر ابراہیم لنکن نے یہ سنہرے اور تاریخی الفاظ کہے کہ :-

"ہر جگہ کے عوام کو، اگر ان کا یہی رجحان ہو اور وہ اس کی طاقت بھی رکھتے ہوں، حق حاصل ہے کہ علم بغاوت بلند کر دیں اور موجودہ حکومت کا تختہ الٹ دیں اور ایک ایسی نئی حکومت، جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر ہو، بنالیں۔ یہ بہت قیمتی اور مقدس حق ہے ——— ایسا حق جس سے ہم امید کرتے ہیں کہ دنیا کی آزادی کا موجب ہو سکتا ہے !"

یہ دور حاضرہ کا سب سے بڑا المیہ ہے کہ اسی امریکہ میں ابراہیم لنکن کی روح کو کچو کے دیئے جا رہے ہیں اور وہاں پر ہی ساری دنیا کے مزدوروں، ان کی تنظیموں، ان کی حکومتوں، ان کے رہنماؤں اور ان کے اصولوں کے خلاف مردہ سازشیں مرتب کی جا رہی ہیں اور پوری انسانیت و کائنات کو تیسری عالمگیر جنگ میں جھونکنے کے ناپاک منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ لیکن یہ امریکی درندے کتنے کمزور ذہنوں کے مالک اور کتنی اوٹ پٹانگ حرکتوں کے مرتکب ہیں، وہ مئی تحریک کے شہید اینجل کے یہ الفاظ بھول گئے جو اس نے پھانسی کے سائے میں کہے تھے :-

"تم ہمیں مار سکتے ہو مگر ہماری تحریک کو نہیں مار سکتے !"

سامراجی ان الفاظ کو بھول گئے تو بھول جائیں، لیکن یہ الفاظ کبھی ہر مزدور، ہر محب وطن اور ہر مجاہد کی نوک زبان پر ہیں۔ یہ سامراجی ابراہیم لنکن کے الفاظ کو بھول گئے تو بھول جائیں لیکن آج بھی "اندھیر نگری چوپٹ راج" کے نمونے ——— امریکہ کے خلاف دنیا کے تمام جمہوریت پسندوں، کو استعمال کرنے والے سرفروشوں نے ایک موفر اور مضبوط متحدہ محاذ بنا لیا ہے کہ اس کالی طاقت کے ہاتھ میں جو خونی پھندے ہیں ———، ان سے اپنی گردنیں محفوظ رکھیں ! اس استعمار کی بھیانک شکلیں آج بڑے خونخوار رخ میں سامنے آ رہی ہیں۔ کانگو اور جنوبی ویت نام کے عوام کا خون ناحق بھی مئی تحریک کے معصوم شہید پیرسنز کی طرح پکار پکار کر یہ کہہ رہا ہے کہ :-

"تم اس آواز کو بند کر سکتے ہو لیکن ایک وقت آئے گا جب ہماری خاموشی ہماری آواز سے بھی زیادہ زوردار ہو گی ———"

موت کے منحوس ہاتھوں میں جھونک دیئے جانے والے قابل احترام شہید مظلومو ! تم مطمئن رہو ! تمہارے یہ روح پرور الفاظ آج بھی ہماری زبان پر ہیں اور انہیں دوسرے تمام انسانوں تک پہنچانا ہم نے اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔ اور جب تک اس دنیا سے بھوک و افلاس، پریشانی و بیماری، لوٹ کھسوٹ اور اونچ نیچ ختم نہ ہو جائے تمہارے یہ تاریخی الفاظ دہرانے کے لئے ہم اور دوسرے شہید ہوتے رہیں گے !

یکم مئی ۱۸۸۶ء کی یہ تحریک، تاریخ کی مسلسل زنجیر کا ایک حصہ ہے یہ کڑی ——— ابتدائی دور کی کڑیوں سے مربوط اور ملحق ہے۔ اس تاریخی زنجیر کی ہر کڑی، شہیدوں کے حیات بخش خون کے قطروں سے جگمگا رہی ہے۔ انسان شروع سے ہی جستجو اور تلاش، حق و صداقت کا متوالا نظر آتا ہے اور جب کچھ پانے کی یہ بے چینی، حد سے آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر وہ خود اپنے ہی خون جگر سے سچائی کے چراغ روشن کر لیتا ہے۔ اور اسی چراغ کی روشنی میں وہ اپنا، اپنے ماحول اور ان کروڑوں انسانوں کا مطالعہ، مشاہدہ شروع کر دیتا ہے جو کہ سب اتھاہ تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں اس نے جب بھی اس دنیا کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھانے کی نیک کوشش کی ہے اسے کوئی نہ کوئی چیز کسی نہ کسی شکل میں آڑے آتی نظر آتی ہے۔ اسے اس تلاش کا صلہ ——— موت ——— کی شکل میں دیا گیا ہے ——— اور وہ یہ سوچتے ہوئے کہ زندگی اور موت ——— اگر بے مقصد ہوں گی تو پھر وہ ——— کوڑے کرکٹ اور مٹی پتھر سے کچھ مختلف نہ ہو گا ——— زندگی کا بھی کوئی نہ کوئی تعمیری مقصد ہونا چاہئے۔ اور موت کا بھی ——— اسی لئے وہ اپنی راہ میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے خوشی خوشی زہر کا پیالہ چڑھا لیتا ہے۔ حالانکہ اس بات کے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنی جان بچا کر راہِ فرار اختیار کر لے۔ مگر نہیں، کیونکہ اس طرح، اس کی تلاش و جستجو کی تگ و دو سے رنگینی بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لہذا وہ زہر کا مزہ چکھتا ہے اور ایک دائمی پیغام چھوڑ جاتا ہے۔ اگر سقراط کے اس پیغام کا سولی پر چڑھتے ہوئے فشر کے ان الفاظ سے موازنہ کر کے دیکھا جائے تو صاف پتہ چل جائے گا کہ یہ تاریخ انسانی کی طویل زنجیر کی دو کڑیاں ہیں :-

"ہم خوش ہیں کہ ہم ایک اچھے کام کے لئے جان دے رہے ہیں ———"

تاریخ کے ہر دور میں وہ آواز سنائی اور وہ تڑپ دکھائی دیتی ہے جو یکم مئی ۱۸۸۶ء کو شکاگو امریکہ میں مزدور شہیدوں کے خون کے فواروں سے عبارت ہے۔ جب بھی کسی معاشرے میں آزادی نہ ہونے کی وجہ سے گھٹن زہر کی شکل اختیار کرنے لگتی ہے تو خیالات اور عمل میں آہستہ آہستہ ایک گہری اور وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے اور اس منحوس معاشرے کی کوکھ سے ایک ایسا اندھیرا

جنم لیتا ہوا نظر آتا ہے جو ساری روشنیوں کا گلا گھونٹ ڈالے گا۔ مگر عجیب قانونِ فطرت ہے کہ کہیں نہ کہیں سے "پرامتھیوز" کی چیخ سننے میں آ جاتی ہے جو کسی نہ کسی "آگ" کا راز معلوم کرنے کے مقدس جرم میں کبھی تو ایک چٹان سے باندھ دیا جاتا ہے اور کبھی کسی قلعہ کی تاریک سرد اور ویران کوٹھڑی میں گلا گھونٹ کر شہید کر دیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح ایک دور میں کسی نہ کسی جگہ کسی نہ کسی "شیشو" کی ننگی گردن نیلی ہو جاتی ہے کیونکہ وہ سارا کا سارا زہر خود پی جاتا ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے —— "آبِ حیات" چھوڑ جاتا ہے۔

تاریخِ انسانی میں صداقت کی دیوی سے زیادہ حسین کوئی دیوی نہیں روشنی کی طلب سے زیادہ شدید کوئی طلب نہیں۔ تلاش کے جذبے سے زیادہ قوی کوئی جذبہ نہیں، مساوات کی مانگ سے زیادہ زوردار کوئی مانگ نہیں آزادی کی خواہش سے پیاری کوئی خواہش نہیں امن کی آرزو سے سہانی کوئی آرزو نہیں اور انصاف سے زیادہ اونچا اور سچا کوئی اصول نہیں۔ اسی لئے ایسے سرپھروں کے خون کے چھینٹوں سے ساری تاریخِ انسانی رنگین ہے جو صداقت، روشنی، تلاش، مساوات، آزادی۔ امن اور انصاف کے حصول کی خاطر "ناممکن" کو "ممکن" بنانے کے لئے تلے ہوئے ہیں اپنی اور اپنے پیاروں کی زندگی کی ساری کی ساری خوشیاں اور مسرتیں ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں ایثار اور خلوص سے دمکتی رہتی ہیں اور وہ ایک "نامعلوم" کو "معلوم" کرنے کے لئے گھٹا ٹوپ سیاہیوں اور گہرائیوں میں اترتی چلی گئی ہیں جہاں سے "مشترکہ محنت، مشترکہ پیداوار اور مشترکہ ملکیت" کے جگمگاتے ہیرے ڈھونڈ اور رازہائے سربستہ کھوج لائی ہیں۔

انسانی تاریخ، ارتقائی منزل طے کرتے ہوئے عروج و زوال کے پرپیچ راستوں سے گزرتی رہی ہے کبھی کبھی تو بالکل ایسا نظر آتا ہے کہ جواب تاریکی ہی تاریکی ہے، تنہائی اور ناکامی و نامرادی کے سوا ہمارے حصہ میں اور کچھ نہیں —— ذرا دیکھو تو تحریکِ مئی کے اس دور میں جب کہ مزدوروں سے حیوانوں کی طرح کام لیا جاتا تھا آخر کون سوچ سکتا تھا کہ فضا میں لہراتا ہوا ہنستے انسانوں کا وہ سفید جھنڈ جو سرنگوں کر کے ان کے ہی خون میں رنگ دیا گیا ہے ایک دن تمام دنیا کے مزدوروں کا پرچم بن جائیگا اور اس پرچم تلے دنیا کے تمام مزدور اپنے اپنے ملک میں عوامی حکومتیں قائم کریں گے۔

جنگ آزادی کے اس دور میں مخالف ہوائیں لاکھاں چراغوں کو بجھانے کے در پے کیوں نہ ہوں، جو خونِ جگر سے جلائے گئے ہیں مگر سارے دیوانے آج یہی کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

"مجھے آزادی دے دو یا موت"

یوں تو سرمایہ کے دلالوں اور بدی کے نمائندوں نے آج بھی ساری دنیا کو چوباڑہ بنا رکھا ہے۔ ہر غلام ملک کا سونا آج بھی امریکی ٹکسالوں میں ڈالر کی شکل میں ڈھل رہا ہے ہر کمزور ملک سے آج بھی کچے مال کو امریکی اجارہ داروں کی صنعت کی ترقی کے لئے بٹور اجا رہا ہے ہر جاہل ملک کے ادھ کھلے ذہنی گلابوں کو آج بھی امریکہ میں تصنیف شدہ تاریخ کے زہر سے مسموم کیا جا رہا ہے ہر محکوم و نیم محکوم ملک میں آج بھی تہذیب و ثقافت کا رخ سفارتی، چھچھوری جنسیت اور شرمناک وحشت کی طرف موڑا جا رہا ہے ہر پسماندہ ملک میں آج بھی محنت کشوں، کسانوں، طالب علموں اور دانشوروں کی چھاتیاں امریکی گولیوں سے چھلنی کی جا رہی ہیں لیکن مئی تحریک کے ایک اور امریکی شہید اسپائیز کے ولولہ انگیز یہ الفاظ آج بھی ہم سب کا سب سے بڑا ہتھیار ہیں،

"سرمایہ دارو! کیا مجھے بھی بولنے کی اجازت ہے
حاکمو! غریب انسانوں کی آواز بلند ہونے دو
نہیں تو پھر ان کی تلواریں بلند ہوں گی—!"

آج یہ الفاظ ہر جگہ گونج رہے ہیں آج یہ ہتھیار ہر جگہ بلند ہو رہے ہیں جنوبی کوریا ہو یا جنوبی ویت نام، ملائشیا ہو یا کانگو، جنوبی افریقہ ہو یا موزمبیق، انگولا ہو یا فلسطین۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ سامراجی طاقتوں کے معاشی پیروں تلے دبی ہوئی، کچلی ہوئی ہر قدم اور ہر ملک یہ رزمیہ الفاظ با آواز بلند اور پورے خروش و خروش کے ساتھ دہرایا رہا ہے۔ سب ہی آج سامراجیوں اور ان کے قابلِ نفرت کتوں سے برسرِ پیکار ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جب بین الاقوامی سامراجیت اور اس کے سرغنہ امریکہ کے جنگ پرست اور آزادی سلب کرنے والے حکمرانوں کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی جائے گی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ یہ آخری کیل "ٹھونکنے" والے خود امریکہ کے باشعور، باہمت اور باضمیر عوام ہی ہوں —— یہ فرض حقیقتاً انہیں کا ہے اور واقعی وہ تحریکِ مئی کے دیتے ہوئے سبق کے مطابق اپنے آپ کو اس فرض کو ادا کرنے کا قابلِ فخر کارنامہ انجام دیں گے۔

آج کے دن ہم بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنی جان سے پیارے وطن —— پاکستان کو بیرونی سامراج امریکہ کے معاشی شکنجے سے چھٹکارہ دلانے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں گے۔ اور مادرِ وطن کی ساری دولت پاکستان کے کروڑوں محنت کشوں میں بغیر کسی طبقاتی امتیاز کے تقسیم کرا کے ہی دم لیں گے!

مئی تحریک کے عظیم شہیدو! ہم تم پر خراجِ عقیدت
کے صدا بہار پھول نچھاور کرتے ہیں ——!

تمہاری ان بنائی ہوئی قمیضوں سے کیا حاصل ہے؟ ایک طرف لاکھوں بکنے والی قمیضیں لٹک رہی ہیں اور دوسری طرف لاکھوں محنت کش جسم، جو ان سے اپنا تن ڈھانک سکتے ہیں ننگے گھوم رہے ہیں، قمیضیں تو انسانی تنوں کے چھپانے کے کام آتی ہیں۔ اگر ان سے یہ کام نہ نکل سکے تو ان کا وجود ایک ناقابلِ برداشت طنز کے سوا اور کچھ نہیں ہے ——————— !

طامس کارلائل

اے زمین کے مالکو! اے لگان بڑھانے والو! اے غیر فطری مالکو! تم اپنے بسر اوقات کیلئے ایک بڑی سالانہ آمدنی رکھتے ہو، پہلے تم کسی دوسرے آدمی کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بیس سے لے کر پچاس پونڈ سالانہ تک لیا کرتے تھے جو مناسب تھا۔ لیکن تم نے اب اسکو بڑھا کر پچاس سے لے کر سو پونڈ سالانہ تک بڑھا لیا ہے ———————

بشپ لاٹیمیر

تصنیف لیو ہیوبرمین
ترجمہ:- نجم الدین شکیب

تم بوتے ہو دوسرا کاٹتا ہے

" خدا کی پناہ! اور ہڑتال کرنے والوں سے عاجز آگئی ہوں یہ ہمیشہ سڑکوں پر ادھر ادھر گھومتے اور دوکانوں اور کارخانوں پر دھرنا دیتے پھرتے ہیں، یہ اپنے ساتھ اپنی منحوس تنظیم کے نشانات بھی لئے لئے گھومتے ہیں۔ آخر حکومت انھیں قید خانوں میں بند کیوں نہیں کر دیتی۔"

ناراض عورت جس نے بس پر بیٹھ کر یہ جملے کہے تھے اپنی تاریخ سے ناواقف تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے ایک بہت آسان مسئلے کا بہت سیدھا سادھا حل پیش کر دیا ہے لیکن وہ غلطی پر تھی۔ اس کے حل کی بارہا آزمائش کی جا چکی تھی۔ لیکن کبھی صحیح نہیں ثابت ہوا تھا۔ لندن کے ایک مجسٹریٹ نے سو سال ہوئے وزارت داخلہ کو ان اسٹرائکوں کے کچلنے کی ایک تدبیر لکھ بھیجی تھی۔ یہ مجسٹریٹ لکھتا ہے:۔

" میں تجویز کرونگا کہ ان سب کو جنھوں نے کام چھوڑ دیا ہے انہیں گرفتار کر لیا جائے اور انھیں پاؤں سے چلانے والی چکیوں پر مشقت کے لئے بھیج دیا جائے۔"

۱۸۳۰ء میں مجسٹریٹ نے بالکل وہی تجویز جو آج یہ عورت پیش کر رہی تھی اپنی حکومت کو بھیجی تھی لیکن اس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کوئی عورت سے پوچھے؟

۱۹ویں صدی کے اس مجسٹریٹ اور بیسویں صدی کی اس عورت دونوں کو نہیں معلوم کہ یہ مزدور محض تفریح طبع کے لئے جھنڈے لئے لئے مارے مارے نہیں گھومتے ہیں۔ یہ مزدور اپنا کام اس لئے نہیں چھوڑتے ہیں کہ وہ کام کرنا نہیں چاہتے۔ ان اسٹرائکوں کے وجوہ دراصل بہت گہرے ہیں ان وجوہ کا پتہ چلانے کیلئے ہم کو انگریزی تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ اس لئے کہ انگلستان ہی وہ جگہ ہے جہاں صنعتی انقلاب نے سب سے پہلے اپنے قدم جمائے تھے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اعداد و شمار کی بہم رسانی سے ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے۔ لیکن انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کی ابتدا میں اعداد و شمار نے واقعات کی جتنی غلط تصویر پیش کی ہے۔ شاید اتنی غلط تصویر کبھی اور کہیں نہیں پیش کی جا سکی ہے اعداد و شمار کے ہر خاکے نے ہر شاخ میں غیر معمولی ترقی دکھائی ہے، روئی، لوہا، کوئلہ اور دوسری چیزوں کی پیداوار میں دس گنا اضافہ دکھائی پڑتا ہے۔ چیزوں کی بری مصنوعات کی کھپت اور مالکوں کے نفع کی بھی کوئی انتہا نہیں رہی ہے ان معلومات پر نگاہ ڈالتے ہی ہم حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ شاید انگلستان اس زمانے میں وہی جنت بن گیا تھا جس کی تعریف میں شاعر ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے انگلستان جنت ضرور بن گیا تھا۔ لیکن صرف چند انے گنے لوگوں کے لئے۔ اکثریت ابھی تک اس فردوس کے قریب بھی نہیں تھی۔ جہاں تک عوام کی فارغ البالی کا تعلق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان اعداد و شمار نے جھوٹی تصویر کھینچنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ایک مصنف نے جسکی کتاب ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی تھی اس تلخ حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

" لاکھوں انسان درحقیقت فاقہ کشی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان بد قسمتوں کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے، تجارت اور بیوپار کی تاریخ میں ایک نئے دور کا اضافہ ہوا ہے۔ اس دور میں بڑھتی اور پھلتی پھولتی تجارت محنت کش طبقے کی خوش حالی کی نہیں بلکہ غربت اور تباہ حالی کی فہرست ہے — یہ وہ منزل ہے جہاں اس وقت برطانیۂ عظمیٰ کا سماج پہنچ چکا ہے۔"

اگر اس وقت مریخ کے باشندے انگلستان کے جزیرے پر اترتے تو وہاں کے باشندوں کی مصروفیت دیکھ کر ضرور کہتے کہ زمین پر پاگلوں کی بستی بسی ہوئی ہے۔ وہ یہ رائے یہ دیکھ کر قائم کرتے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت دن بھر بہت سخت محنت کرتی ہے اور رات بڑے ایسی تاریک جھونپڑیوں میں جہاں سور بھی رہنا پسند نہ کریں، جا کر پڑ رہتی ہے۔ دوسری طرف چند لوگ جو اپنے ہاتھوں میں محنت کا میل بھی لگنے نہیں دیتے اس محنت کش اکثریت کے لئے قوانین بناتے ہیں اور اپنے اپنے محلوں میں بادشاہوں کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں درحقیقت انگلستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ڈزرائیلی نے سبل میں لکھا ہے۔

" دو قومیں ہیں جن کے درمیان نہ باہمی سلوک ہے اور نہ ہمدردی دونوں قومیں ایک دوسرے کے عادات و اطوار، خیالات اور محسوسات سے بھی بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ دونوں قومیں دنیا کے دو الگ الگ گوشوں میں رہنے والی ہوں یا دونوں ایسے دو ستاروں کی باسی ہوں جن میں آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ انکی نسلیں بھی الگ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ دونوں قومیں الگ الگ غذائیں بھی استعمال کرتی ہیں۔ ان کے انداز و اطوار بھی مختلف ہیں اور ان دونوں کے لئے الگ الگ قوانین بھی وضع کئے گئے ہیں۔"

" تم کس کا ذکر کر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟" اگریمانٹ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

" امیروں اور غریبوں کا۔"

یہ تقسیم نئی نہ تھی۔ لیکن پہلے اتنی واضح نہ تھی۔ لیکن مشین کے ڈھلتے ہی اور فیکٹری سسٹم کے رائج ہوتے ہی ان دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل کچھ زیادہ نمایاں اور صاف ہو گئی، مالدار مالدار ہوتے گئے اور غریب اپنے ذرائع پیداوار سے کٹ کر غریب تر۔ اس کا اثر دستکاروں پر اور بھی برا ہوا جو پہلے اپنی گزر اوقات کے لئے معقول رقم پیدا کر لیا کرتے تھے لیکن اب مشینی مصنوعات سے مقابلے کی وجہ سے بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم ذیل میں ایک پارچہ باف تھامس ہیتھ کا بیان دے رہے ہیں اس بیان سے ان لوگوں کی پریشان حالی اور شکستہ دلی کا اندازہ اچھی طرح ہو جائیگا۔

بھائی کو بھی اپنی مدد کیلئے نچ کے طور پر لگا لیا تھا ذیل میں اسکی داستان کا ایک حصّہ دیا جاتا ہے۔

"جب کبھی ہم اونگھ جاتے تھے، یہ لوگ ہم کو چمڑے سے سزا دیتے تھے۔ کیسلس میرے انگوٹھے کے برابر موٹی رسی بٹتا، اس کو دوہرا کرتا اور اس میں گرہیں لگاتا تھا۔ میں چھ بجے سے کچھ پہلے فیکٹری جایا کرتا تھا کبھی کبھی پانچ بجے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور رات ساڑھے نو بجے تک کام کرتا رہتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ تو رات بھر کام کیا تھا۔ ہم نے یہ خود پسند کیا تھا۔ ہم خرچ کرنے کے لئے کچھ اور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دن ہم چھ بجے صبح سے کام کر رہے تھے۔ ہم دوسرے دن نو بجے رات تک برابر کام کرتے رہے۔ میں آجکل رسی بٹنے والے قطعے پر کام کرتا ہوں، میں آج کل تقریباً ۴ شلنگ فی ہفتہ پیدا کرتا ہوں۔ میرا بھائی میری طرف سے کام کرتا ہے۔ وہ صرف سات سال کا ہے میں اسکو کچھ نہیں دیتا ہوں۔ اگر وہ میرا بھائی نہ ہوتا تو مجھے اسکو کم از کم ایک شلنگ ہفتہ وار دینا پڑتا۔ میں اسکو اپنے ساتھ چھ بجے لے جاتا ہوں اور رات کو آٹھ بجے تک اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

بچوں کا اتنی کم عمری میں کام کرنا کوئی نئی بات نہ تھی، ہم ڈیفو کے بیان میں ان کو اپنے گھروں میں کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن اسوقت وہ اپنے گھروں میں اپنے والدین کی مدد کے لئے کام کرتے تھے۔ لیکن نئے نظام میں انکے کام کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ پہلے وہ اپنے والدین کی نگرانی میں کام کرتے تھے ان کے کام کا وقت بھی وہی ہوتا تھا جوان کے والدین مقرر کرتے تھے۔ اب وہ فیکٹریوں میں نوکر تھے۔ ان سے وہ نگران کار کام لیتا تھا جس کو اس کے نازک جسموں اور ننھی عمروں سے زیادہ اپنے کام کی فکر ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ان بچوں سے بھی وہ جتنا زیادہ سے زیادہ کام لے سکے لے، ان بچوں کے کام کے اوقات بھی مالکوں کے ہاتھ میں تھے یہ مالک انکی نازک عمروں سے کم اور اپنے بھاری منافع سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے ویسٹ انڈین کمپنیوں کے بردہ فروش بھی جو غلاموں کی تجارت کرتے تھے اتنے بےرحم نہ تھے ان کو بھی ان ننھی ننھی روحوں کو اس طرح کام میں لگا ہوا دیکھ کر ترس آجاتا تھا۔ ان تاجروں میں سے کسی نے بریڈ فورڈ کے تین مل مالکان سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا۔

"میں نے ان غلاموں کے تاجر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی نگاہوں میں ذلیل پایا۔ میں نے تو جزائر غرب الہند میں کسی شخص کو اتنا ظالم نہیں پایا کہ وہ نو برس کے بچوں سے ساڑھے بارہ گھنٹے یومیہ کام لیتا ہو۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہارا روز مرہ کا معمول ہے۔"

یہ غلاموں کا تاجر فیکٹریوں کے مالکوں کو ایک اور مثال دے کر بھی سمجھا سکتا تھا کوئی شبہ نہیں جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ کی غلاموں کی تجارت اپنی جگہ پر کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ان غلاموں کے رہنے کے لئے جو مکانات وہاں بنوائے گئے تھے وہ ان گھروں سے کہیں بہتر تھے۔ جو ان مزدوروں کو رہنے کے لئے انگلستان کے شہروں میں جہاں فیکٹریاں قائم تھیں دیئے جاتے تھے، بھاپ انجن کی ایجاد نے فیکٹریوں کو دریا کے کنارے سے آزاد کر دیا تھا اور اب وہ آزادی سے کوئلے کی کانوں کے پاس اٹھ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے معمولی مقامات قصبے اور قصبے شہر بن گئے ۱۸۰۱ء میں انگلستان کی چالیس فیصدی آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ۱۸۴۱ء میں یہ آبادی گھٹ کر ۲۶ فیصد رہ گئی۔ شہروں کی آبادی اور انکی ترقی کی رفتار ذیل کے خاکے سے اچھی طرح واضح ہو جائے گی

	۱۸۰۱ء	۱۸۴۱ء
مانچسٹر	۳۵۰۰۰	۳۵۳۰۰۰
لیڈس	۵۳۰۰۰	۱۵۲۰۰۰
برمنگھم	۲۳۰۰۰	۱۸۱۰۰۰
شیفیلڈ	۴۶۰۰۰	۱۱۱۰۰۰

مشہور مقامات مشہور چیزیں تیار کر رہے تھے۔ لیکن یہ چیزیں وہ مزدور بناتے تھے جو تاریک، غیر صحت بخش، گنجان اور گندے حصوں میں رہتے تھے۔ مشہور ماہر اقتصادیات ناسا ینئر نے ۱۸۳۷ء میں مانچسٹر کے ایک حصہ کا حال دیکھا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔:۔

"یہ قصبے جو اپنی وسعت اور آبادی کی تعداد کے لحاظ سے قصبے ہیں کچھ عجیب رنگ سے بسائے گئے تھے۔ انکی تعمیر میں حریص تعمیر کنندگان کے فوری نفع کے سوا اور کسی بات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ میں نے ایک جگہ ایک ایسی سڑک دیکھی جو ایک خندق کی سیدھ میں بنائی گئی تھی۔ غرض یہ تھی کہ اس طرح بہت کم کھدائی کا خرچ برداشت کر کے سڑک کے کنارے کنارے زمین دوز کوٹھریاں بنوا دی جائیں گی یہ کوٹھری تجارتی سامان رکھنے کے لئے نہیں انسانوں کے رکھنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ان گھروں میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو ہیضے کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکا ہو۔ عام طور سے ان اطراف کی سڑکیں خام ہیں اور اکثر جگہوں پر ان سڑکوں کے بیچ میں گوبر ڈالنے کے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ یہ گھر ایک دوسرے کی پشت پر بنائے گئے ہیں اور ان میں ہوا اور پانی بہانے اور نکالنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ مزدور کے خاندان انھیں زمین دوز مکانوں یا ان کے اوپر کے جھونپڑوں کے کونوں میں پڑے رہتے ہیں۔"

اوپر کے اقتباس میں خط کشیدہ جملہ غور سے پڑھو! ان غریبوں کی تندرستیوں پر رہائش کے اتنے خراب انتظامات کا اثر کتنا برا پڑتا ہوگا! یہ مکانات موت کی کمین گاہ تھے۔ وہ دبے پاؤں آتی اور ان بدقسمت انسانوں کا قتل عام کر کے چلی آتی۔ وہ لوگ جو شہر کے ان حصوں سے دور رہتے تھے بہت خوش قسمت تھے۔ اس زمانے میں تمہاری عمر کی درازی ان جگہوں پر منحصر تھی، جہاں تم رہتے تھے تم ان سڑکوں سے جہاں یہ بدقسمت مزدور رہتے تھے دور رہتے تو زیادہ عمر پاتے۔ ڈاکٹر پی، ایچ ہالینڈ نے ۱۸۴۴ء میں مانچسٹر کے مضافات کے متعلق تحقیق کر کے لکھا تھا:۔

"جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض محلوں میں شرح اموات بعض دوسرے محلوں سے چوگنی ہے اور ان محلوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں جن کی حالت خراب ہے۔ جن محلوں کی حالت اچھی ہے وہاں موتیں کم ہوتی ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے یہ ساتھی اور پڑوسی صرف حفظان صحت کی ظاہری تدبیروں کے نہ ہونے کی وجہ سے سالانہ ہزاروں کی تعداد میں موت کی نذر ہوتے رہتے ہیں۔"

آخر یہ "مالدار قوم" ان قریبی پڑوسیوں کی عام بربادی سے کچھ متاثر ہوتی تھی یا انھیں ان غریبوں کے متعلق ان دولتمندوں کا طرز عمل کیا تھا۔ اور وہ فیکٹری کے ان خراب حالات، رات بڑھے تک کام کرنے کے اوقات اور معصوم بچوں کی محنت اور مزدوری کے متعلق کیا سوچتے تھے؟ ان کی بڑی تعداد تو ان سوالات پر سوچنے کی عادی ہی نہ تھی۔ کبھی کچھ ایسے ہی حالات سامنے آجاتے تھے جو ان کو

بھائی کو بھی اپنی مدد کیلئے بچے کے طور پر لگا لیا تھا ذیل میں اسکی داستان کا ایک حصّہ دیا جاتا ہے۔

"جب کبھی ہم اونگھ جاتے تھے، یہ لوگ ہم کو چمڑے سے سزا دیتے تھے۔ کیسلس میرے انگوٹھے کے برابر موٹی رسی بٹتا، اس کو دوہرا کرتا اور اس میں گرہیں لگاتا تھا۔ میں چھ بجے سے کچھ پہلے فیکٹری جایا کرتا تھا کبھی کبھی پانچ بجے پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور رات بڑھے نو بجے تک کام کرتا رہتا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ تو رات بھر کام کیا تھا۔ ہم نے یہ خود پسند کیا تھا۔ ہم خرچ کرنے کے لئے کچھ اور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دن ہم چھ بجے صبح سے کام کر رہے تھے۔ ہم دوسرے دن نو بجے رات تک برابر کام کرتے رہے۔ میں آجکل رسی بٹنے والے قطعے پر کام کرتا ہوں، میں آج کل تقریباً ۴ شلنگ فی ہفتہ پیدا کرتا ہوں۔ میرا بھائی میری طرف سے کام کرتا ہے۔ وہ صرف سات سال کا ہے میں اسکو کچھ نہیں دیتا ہوں۔ اگر وہ میرا بھائی نہ ہوتا تو مجھے اسکو کم از کم ایک شلنگ ہفتہ وار دینا پڑتا۔ میں اسکو اپنے ساتھ چھ بجے لے جاتا ہوں اور رات کو آٹھ بجے تک اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔"

بچوں کا اتنی کم عمری میں کام کرنا کوئی نئی بات نہ تھی، ہم ڈیفو کے بیان میں ان کو اپنے گھروں میں کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، لیکن اسوقت وہ اپنے گھروں میں اپنے والدین کی مدد کے لئے کام کرتے تھے۔ لیکن نئے نظام میں انکے کام کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ پہلے وہ اپنے والدین کی نگرانی میں کام کرتے تھے ان کے کام کا وقت بھی وہی ہوتا تھا جو ان کے والدین مقرر کرتے تھے۔ اب وہ فیکٹریوں میں نوکر تھے۔ ان سے وہ نگران کار کام لیتا تھا جس کو اس کے نازک جسموں اور ننھی عمروں سے زیادہ اپنے کام کی فکر ہوتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ان بچوں سے بھی وہ جتنا زیادہ سے زیادہ کام لے سکے لے، ان بچوں کے کام کے اوقات بھی مالکوں کے ہاتھ میں تھے یہ مالک انکی نازک عمروں سے کم اور اپنے بھاری منافع سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے ویسٹ انڈین کمپنیوں کے بردہ فروش بھی جو غلاموں کی تجارت کرتے تھے اتنے بے رحم نہ تھے ان کو بھی ان ننھی ننھی روحوں کو اس طرح کام میں لگا ہوا دیکھ کر ترس آجاتا تھا۔ ان تاجروں میں سے کسی نے بریڈ فورڈ کے تین مل مالکان سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا۔

"میں نے ان غلاموں کے تاجر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی نگاہوں میں ذلیل پایا۔ میں نے تو جزائر غرب الہند میں کسی شخص کو اتنا ظالم نہیں پایا کہ وہ نو برس کے بچوں سے ساڑھے بارہ گھنٹے یومیہ کام لیتا ہو۔ اور تم کہتے ہو کہ یہ تمہارا روز مرہ کا معمول ہے۔"

یہ غلاموں کا تاجر فیکٹریوں کے مالکوں کو ایک اور مثال دے کر بھی سمجھا سکتا تھا کوئی شبہ نہیں جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ کی غلاموں کی تجارت اپنی جگہ پر کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ان غلاموں کے رہنے کے لئے جو مکانات وہاں بنوائے گئے تھے وہ ان گھروں سے کہیں بہتر تھے۔ جو ان مزدوروں کو رہنے کے لئے انگلستان کے شہروں میں جہاں فیکٹریاں قائم تھیں دیئے جاتے تھے، بھاپ انجن کی ایجاد نے فیکٹریوں کو دریا کے کنارے سے آزاد کر دیا تھا اور اب وہ آزادی سے کوئلے کی کانوں کے پاس اٹھ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے معمولی مقامات قصبے اور قصبے شہر بن گئے ۱۸۰۱ء میں انگلستان کی چالیس فیصدی آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی۔ ۱۸۴۱ء میں یہ آبادی گھٹ کر ۲۶ فیصد رہ گئی۔ شہروں کی آبادی اور انکی ترقی کی رفتار ذیل کے خاکے سے اچھی طرح واضح ہو جائے گی

	۱۸۰۱ء	۱۸۴۱ء
مانچسٹر	۳۵۰۰۰	۳۵۳۰۰۰
لیڈس	۵۳۰۰۰	۱۵۲۰۰۰
برمنگھم	۲۳۰۰۰	۱۸۱۰۰۰
شیفیلڈ	۴۶۰۰۰	۱۱۱۰۰۰

مشہور مقامات مشہور چیزیں تیار کر رہے تھے۔ لیکن یہ چیزیں وہ مزدور بناتے تھے جو تاریک، غیر صحت بخش، گنجان اور گندے حصوں میں رہتے تھے۔ مشہور ماہر اقتصادیات ناسائینر نے ۱۸۳۷ء میں مانچسٹر کے ایک حصہ کا حال دیکھا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔:۔

"یہ قصبے جو اپنی وسعت اور آبادی کی تعداد کے لحاظ سے قصبے ہیں کچھ عجیب رنگ سے بسائے گئے تھے۔ انکی تعمیر میں حریص تعمیر کنندگان کے فوری نفع کے سوا اور کسی بات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ میں نے ایک جگہ ایک ایسی سڑک دیکھی جو ایک خندق کی سیدھ میں بنائی گئی تھی۔ غرض یہ تھی کہ اس طرح بہت کم کھدائی کا خرچ برداشت کر کے سڑک کے کنارے کنارے زمین دوز کوٹھریاں بنوادی جائیں گی یہ کوٹھری تجارتی سامان رکھنے کے لئے نہیں انسانوں کے رکھنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ان گھروں میں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جو ہیضے کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکا ہو۔ عام طور سے ان اطراف کی سڑکیں خام ہیں اور اکثر، جگہوں پر ان سڑکوں کے بیچ میں گوبر ڈالنے کے گڑھے کھدے ہوئے ہیں۔ یہ گھر ایک دوسرے کی پشت پر بنائے گئے ہیں اور ان میں ہوا اور پانی بہانے اور نکالنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ مزدوروں کے خاندان انھیں زمین دوز مکانوں یا ان کے اوپر کے جھونپڑوں کے کونوں میں پڑے رہتے ہیں۔"

اوپر کے اقتباس میں خط کشیدہ جملہ غور سے پڑھو! ان غریبوں کی تندرستیوں پر رہائش کے اتنے خراب انتظامات کا اثر کتنا برا پڑتا ہوگا! یہ مکانات موت کی کمین گاہ تھے۔ وہ دبے پاؤں آتی اور ان بد قسمت انسانوں کا قتل عام کر کے چلی آتی۔ وہ لوگ جو شہر کے ان حصوں سے دور رہتے تھے بہت خوش قسمت تھے۔ اس زمانے میں تمہاری عمر کی درازی ان جگہوں پر منحصر تھی، جہاں تم رہتے تھے تم ان سڑکوں سے جہاں یہ بد قسمت مزدور رہتے تھے دور رہتے تو زیادہ عمر پاتے۔ ڈاکٹر پی، ایچ ہالینڈ نے ۱۸۴۴ء میں مانچسٹر کے مضافات کے متعلق تحقیق کر کے لکھا تھا:۔

"جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض محلوں میں شرح اموات بعض دوسرے محلوں سے چوگنی ہے اور ان محلوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں جن کی حالت خراب ہے۔ جن محلوں کی حالت اچھی ہے وہاں موتیں کم ہوتی ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے یہ ساتھی اور پڑوسی صرف حفظان صحت کی ظاہری تدبیروں کے نہ ہونے کی وجہ سے سالانہ ہزاروں کی تعداد میں موت کی نذر ہوتے رہتے ہیں۔"

آخر یہ "مالدار قوم" ان قریبی پڑوسیوں کی عام بربادی سے کچھ متاثر ہوتی تھی یا انھیں ان غریبوں کے متعلق ان دولتمندوں کا طرز عمل کیا تھا۔ اور وہ فیکٹری کے ان خراب حالات، رات بڑھے تک کام کرنے کے اوقات اور معصوم بچوں کی محنت اور مزدوری کے متعلق کیا سوچتے تھے؟ ان کی بڑی تعداد تو ان سوالات پر سوچنے کی عادی ہی نہ تھی۔ کبھی کچھ ایسے ہی حالات سامنے آجاتے تھے جو ان کو

سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے تو ان کو انجیل مقدس کا یہ جملہ یاد آجاتا تھا:۔

"تمہارے ساتھ غریب ہمیشہ رہتے ہیں"

انجیل مقدس نے انسانوں کو اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ جس قسم کے برتاؤ کی ہدایت کی تھی وہ کبھی اس کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے مطلب کی بات پڑھتے تھے اور جو بات ان کے لئے مفید نہیں ہوتی تھی وہ سنتے ہی نہ تھے۔

آج ہم کو جو باتیں بہت ہولناک معلوم ہوتی ہیں وہ اس زمانے کے دولتمند طبقے کے نزدیک بہت مناسب تھیں۔ لڑکوں کا اسکول نہ جانا اور چودہ گھنٹے روزانہ فیکٹریوں میں کام کرنا بہت برا ہے؟ کتنی احمقانہ ہے یہ بات! جی اے لی جو ایک کاٹن مل کا (جس میں چھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک کام ہوتا رہتا تھا۔) مالک تھا۔ کہا:

"اخلاق کے لئے اس سے زیادہ مفید اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کہ انسان بالکل ابتدائی عمر سے مطیع اور فرمانبردار، ہنرمند اور پابند اوقات ہو جائے"

مسٹر لی کو غریبوں کے اخلاق کی بڑی فکر تھی۔ گڈی بھی جو رائل سوسائٹی کا صدر تھا مزدور بچوں کی تعلیم کا بڑا مخالف تھا اس نے ایک ابتدائی اسکول کے قیام کی تجویز کی، جو مزدور بچوں کے لئے قائم ہونے والا تھا سخت مخالفت کی تھی۔ گڈی نے اپنے دلچسپ دلائل اس طرح پیش کئے:

"نیچے طبقے کے مزدور بچوں کو تعلیم دلانے کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ ان کے اخلاق بھی بگڑ جائیں گے، ان کی دلی مسرت بھی چھن جائے گی یہ تعلیم ان کو اپنی موجودہ حالت پر قانع نہ رہنے دے گی اور نہ وہ کھیتی کسانی کے لئے اچھے نوکر ثابت ہو سکیں گے اور نہ کسی محنت طلب ملازمت کے لائق رہ جائیں گے۔ سماج میں دراصل ان کے یہی اصل فرائض ہیں۔ اب تعلیم پانے کے بعد وہ ان کاموں کے بجائے باغیانہ رسالے پڑھنے کے لائق ہو جائیں گے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے بڑوں کی شان میں گستاخیوں کے مرتکب ہونے لگیں گے"

اسی دور کے ایک اور شخص کی شہادت بھی مطالعہ کے لائق ہے یہ شخص ان غریبوں کو قسمت کی شکایت کی بجائے اس کے شکرگزار ہونے کی نصیحت کرتا ہے اس کے نزدیک وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے جن کو اس "انعام الٰہی" فیکٹری میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ انڈریو ار کا یہی خیال ہے۔ اس نے سنہ ۱۸۵۳ء میں لکھا:۔

"میں نے اپنے اس سفر میں ہزاروں بوڑھوں بچوں اور درمیانی عمر کے لوگوں کو جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ بے اندازہ غذائی سامان کپڑے اور ضرورت کی چیزیں تیار کر رہے تھے۔ ان کے بدن کا کوئی رواں عرق ریز نہ تھا یہ دھوپ کی گرمی اور برفیلی ہوا کی جھونکوں سے محفوظ تھے۔ یہ جن جگہوں میں کام کر رہے تھے وہ بہت ہوادار اور صحت بخش تھیں ان کا مقابلہ ہمارے شہروں کے اعلیٰ طبقے والے امرا کی حویلیاں بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ مکان بہت آرام دہ ہیں اور اپنے حسن تعمیر میں ایشیائی، مصری اور رومن مطلق العنان بادشاہوں اور امیروں کی مایۂ ناز عمارتوں کو بھی مات کرتے ہیں ـــــ کیسا اچھا ہے یہ فیکٹری کا نظام"!

یہ بات خاص طور سے نگاہ میں رکھنے کے لائق ہے کہ ڈاکٹر ار نے ان فیکٹریوں صرف سیاحت ہی کی تھی۔ کبھی اس کو ان فیکٹریوں میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ڈاکٹر ار کی قصیدہ خوانی سے پہلے ایک رکن کلیسا نے ان بدقسمت غریبوں کی تسکین اور تشفی کے لئے چند جملے کہے تھے۔ یہ کلیسا کا کوئی معمولی رکن نہ تھا بلکہ آرچ ڈیکن پیلے تھا اس نے ان محنت کشوں کے آنسو جو اپنی بدقسمتی پر نوحہ کناں تھے اور امیروں کی فارغ البالی کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، اس طرح پونچھے تھے:۔

"غریبی ایک بات ضرور عطا کرتی ہے۔ یہ بات صرف محنت کشی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ اصل مسرت بھی ہاتھ آتی ہے۔ کفایت شعاری اپنی جگہ پر بڑی راحتوں کی موجب ہے، یہ توجہ اور تدبیر دونوں کے استعمال سے اطمینان عطا کرتی ہے۔ یہ بات ہم کو وہاں نصیب نہیں ہوتی جہاں نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ دولت کے ڈھیر سے نکال نکال کر خرچ کرنے میں کوئی مزا نہیں ہے ـــــ غریب طبقوں کے لوگوں کو ایک بڑی سہولت نصیب ہے وہ بڑی آسانی سے اپنے بچوں کی تربیت کر لیتے ہیں۔ ایک غریب آدمی کے بچے کو اپنی تربیت کے لئے صرف دو باتوں کی ضرورت ہے ـــــ ہنر اور معصومیت۔"

اگر کوئی غریب بے وقوف اور ضدی ہو، آرچ ڈیکن کی گفتگو اس کی سمجھ میں نہ آئے گی اور وہ بدستور اسی بات پر اڑا رہے کہ غربت کو کسی طرح مسرت و شادمانی کا مرادف نہیں سمجھا جا سکتا تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں، آرچ ڈیکن کے ترکش میں کچھ ایسے تیر بھی ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس کو اپنی راہ پر لا سکتا ہے۔ غریب محنت کش امیروں کے عیش و آرام پر رشک کرتے ہیں کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ! رشک تو امیروں کو کرنا چاہئیے۔ عیش و آرام سے پہلے اگر سخت محنت کی منزل نہ ہو تو عیش آرام کا کوئی لطف نہیں وہ کس مزے میں کہتا ہے:۔

"ایک دوسری بات جو غریبوں کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ امیروں کی حالت پر رشک کریں انکی راحت ہے۔ یہیں وہ حقیقت کے سمجھنے میں بنیادی غلطی کر جاتے ہیں۔ راحت تو دراصل نام ہے محنت کے ختم ہو جانے کا۔ راحت کا مزا تو دراصل اس وقت تک آ ہی نہیں سکتا جب تک کسی پر پوری طرح تھکن طاری نہ ہو جائے۔ امیر لوگ تو خود بڑی حسرت اور رشک کی نگاہ سے غریبوں کی اس تازگی اور راحت کو دیکھتے ہیں۔ جو انکو سخت محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے"!

آرچ ڈیکن پیلے نے یہ تسکین بخش جملے ۱۷۹۳ء میں کہے تھے۔ تم کو یاد ہوگا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کے محنت کش غریب وہاں کے امتیازی طبقے کے خلاف کھڑے ہو رہے تھے۔ انقلاب فرانس ایک خونیں واقعہ تھا۔ انگلستان کے امراء ان واقعات سے خوش نہ تھے۔ ان کو فرانسیسیوں کا یہ خونیں نعرہ کہ "ان کے سر قلم کر دو" بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ سمندر پار کی ہوائیں اس نعرے کو اڑا کر انگلستان کے تباہ حال طبقوں تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ تھی غریبوں کا یہ دوست پہلے غریب انگریزوں کو جو اپنی جگہ پر خود ابال کھا رہے تھے ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا ـــــ وہ نصیحت کرتا ہے:۔

"تغیر" اور صرف تدریجی تغیر ہی جو رفتہ رفتہ ترقی کے راستے پر ڈال دے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ تدریجی تغیر تو دراصل کامیاب صنعت کا قدرتی پھل ہے ـــــ اس کی توقع تو صرف عوامی امن اور اطمینان کی راہ سے کی جا سکتی ہے۔ کسی اور راہ سے اس کی امید فضول ہے۔ امیروں کے مرتبے اور انکی دولت پر حسد کرنا اور ، طاقت استعمال کر کے ان سے یہ چیزیں چھیننے کے منصوبے باندھنا

اور ایک عام بے چینی اور بدامنی پیدا کرکے اپنا مقصد حاصل کرنا صرف پاجی پن ہی نہیں بلکہ حماقت بھی ہے۔"

انگلستان کے غریبوں نے ارکان کلیسا کی نصیحتیں مان لیں انھوں نے امیروں کی دولت پر زبردستی قبضہ نہیں کیا۔ لیکن وہ عرصہ تک تدریجی تغیر کے "قدرتی پھل" کی راہ دیکھتے رہے لیکن اس طرح کا کوئی تدریجی انقلاب نہیں آیا اور آخرکار ان کو بھی اپنے حقوق کے لئے لڑنا پڑا۔

انگلستان کے محنت کش طبقوں نے کام کا وقت کم کرانے کے لئے جدوجہد شروع کی اس کشمکش میں بعض امیروں نے بھی جو انسانی ہمدردی سے خالی نہ تھے ان کا ساتھ دیا۔ وہ اب تیرہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بعض امیروں نے پارلیمنٹ میں بھی ان غریبوں کی وکالت کی۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں سفارش کی کہ کام کا وقت گھٹا کر تیرہ چودہ گھنٹے کی بجائے دس گھنٹے یومیہ کر دیا جائے انھوں نے اپنے بعض ساتھی، ممبروں کو بھی آمادہ کر لیا کہ وہ رائے شماری کے وقت ان کا ساتھ دیں انکی اس تحریک نے بہتوں کو ناراض کر دیا۔ ان لوگوں میں جو ان کے اس طرز عمل کو پسند نہیں کرتے تھے ڈاکٹر آر بھی تھا اس نے ایک بڑی دلچسپ دلیل کا سہارا لے کر کہا:

"دارالعوام کے ۹۳ ممبروں میں سے ہر ایک کو جو ٹھنڈے دل سے غور کرے گا یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو یہ رائے دینے کا مستحق سمجھے کہ عاقل و بالغ کاریگروں کے ایک طبقے کو صرف دس گھنٹے یومیہ کام کرنے پر مجبور کیا جائے یہ رعایا کی آزادی میں خلل ہے۔ مسیحی دنیا کا کوئی ایوان قانون سازی کو جائز نہیں رکھ سکتا گلوسٹر شائر کے مالکان کارخانہ نے بجا طور پر اس تجویز کو قرون مظلمہ کے شایان شان قرار دیا ہے۔"

ڈاکٹر آر بھی آرچ ڈیکن پیلے کی طرح محنت کش عوام کی دوستی اور ہمدردی کا مدعی تھا۔ شاید اسی لئے وہ گلوسٹر شائر کے مالکان کارخانہ کا ہم زبان ہو کر ان تجاویز کی مخالفت پر تلا ہوا تھا جو مزدور کی اس آزادی پر وہ اپنے مالک کی مرضی کے مطابق جتنی دیر تک چاہے کام کرتا رہے، اثر انداز ہونے والی تھیں۔ انگریزوں کی اس تاریخی حریت پسندی پر کیا حرف آتا۔ اگر دارالعوام ان سے ان کا یہ نا الگ ہونے والا حق چھین لیتا" اگر وہ چاہیں تو ان کے مالک ان پر کام کا اتنا بوجھ ڈال سکتے ہیں کہ وہ انھیں اٹھاتے اٹھاتے مر جائیں۔"

یہ دلیل کہ کام کے اوقات میں تحدید ایک آدمی کی قدرتی آزادی میں مداخلت ہے اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ یہ دلیل امریکہ اور انگلستان میں بار بار پیش کی گئی کارخانوں کے مالکوں نے یہ دلیل آدم سمتھ سے لی تھی جو "ہمیں تنہا چھوڑ دو" کے نعرے کا علمبردار تھا۔ (لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ محنت کش مزدور اس دلیل کے بموجب اپنے قدرتی حق کے اتلاف کا شاکی نہ تھا) یہ صحیح ہے کہ آدم سمتھ نے جو "تجارتی نظریۂ زر" کے حامیوں کی عائد کی ہوئی پابندیوں کا سخت دشمن تھا۔ اس طرح کی مداخلت کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ کارخانوں کے مالک آدم سمتھ کی کتاب "قوموں کی دولت" (WEALTH OF NATION) کا یہ اقتباس پیش کرتے تھے۔

"وہ ملکیت جو ہر آدمی اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے۔ اور جو در اصل دوسری تمام املاک کی بنیاد ہے، بہت مقدس ہے۔ اس پر کبھی حملہ نہیں کیا جا سکتا ایک غریب آدمی کی آبائی املاک اسکی محنت کشی اور اس کے ہاتھوں کی ہنرمندی کی رہین منت ہے کسی شخص کو اپنی محنت اور ہنرمندی کے استعمال سے روکنا اس مقدس املاک میں صریحی بے جا مداخلت ہے ہر شخص کو مجاز ہونا چاہئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے پڑوسی کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی محنت اور ہنرمندی کا استعمال کرے ــــ اس کا اندازہ کرنا کہ وہ اس لائق ہے کہ اسے کام دیا جائے یا نہیں کام دینے والے کے فرائض اور اختیار میں شامل ہے۔ اسی کے مفاد سے اس کا تعلق بھی ہے۔"

آدم سمتھ نے مذکورہ بالا دلائل حامیان نظریۂ زر کے امتناعی ضوابط اور انکی عاید کردہ پابندیوں کے خلاف کئے تھے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کارخانوں کے مالک بھی یہ دلیل جو ۱۷۷۶ء میں پیش کی گئی تھی، دوسرے قسم کے ضوابط اور دوسری قسم کی پابندیوں کے خلاف ہی استعمال کر رہے تھے۔ آؤ تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ آدم سمتھ کے دلائل کا حوالہ ان کارخانوں کے مالکوں کیلئے اسوقت نامناسب نہ تھا لیکن، ان کو یہ نہ بھولنا چاہئے تھا کہ آدم سمتھ کے یہ دلائل اس وقت جب یہ پیش کئے گئے تھے ان کے حق میں نہ تھے۔ آدم سمتھ کے ان دلائل کا انتخاب جو ان کے مفاد کے لئے موزوں ہوں اور ان دلائل سے روگردانی جو ان کے مفاد کے خلاف ہوں حکمران طبقے کی عادت میں داخل ہے۔ اس عادت سے اس وقت بھی صرف اسی طبقے کو فائدہ بھی پہنچ سکتا تھا۔ لیکن استدلال کا یہ طرز محنت کش جماعتوں کے لئے سخت تباہ کن تھا۔

آخر یہ محنت کش اپنی حالت سنبھالنے کے لئے کیا طرز عمل اختیار کرتا۔ اسکی اس تباہ حالی کے علاج کے لئے کیا نسخہ تجویز کیا جا سکتا تھا؟ فرض کرو وہ بنیائن اور موزے بن کر اپنی گذر اوقات کے لئے ایک معقول رقم پیدا کر لیتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ان فیکٹریوں کو قائم ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان فیکٹریوں میں بنیائنوں اور موزوں کی بہت بڑی تعداد بہت سستے داموں میں تیار ہونے لگی رفتہ رفتہ ان فیکٹریوں کے بنائے ہوئے سستے مال کے مقابلے میں اس کی بنیائین اور موزے مہنگے پڑنے لگے۔ اب اس کے مال کے گاہک ختم ہوگئے اور رفتہ رفتہ وہ فاقہ کشی پر مجبور ہوگیا۔ اب ان اچھے دنوں کا نگاہوں میں پھرنا۔ جب یہ رقیب فیکٹریاں قائم نہ ہوئی تھیں بالکل قدرتی عمل تھا۔ اور ان اچھے دنوں کی یاد جب وہ اچھی طرح کھاتا پیتا تھا اس کے دماغ کے لئے ماضی کی صرف ایک حسین تصویر تھی۔ اس تصویر سے نگاہ ہٹاتے ہی پھر وہ اپنے حال کی بھیانک ویرانی دیکھ کر کانپ اٹھتا ہوگا۔ وہ اپنے دل سے اس تباہی کی وجوہ پوچھتا ہوگا یہ پوچھ گچھ نئی نہ ہوگی۔ وہ پہلے بھی بارہا یہ سوال اپنے دل سے پوچھ چکا ہوگا۔ اور ہر بار اس کے دل نے یہی جواب دیا ہوگا کہ "تمہاری تباہی کی جڑ یہی مشین ہے"۔ یہ مشین ہی تھی جس نے لوگوں سے روزگار چھین لیا تھا۔ یہ مشین ہی تھی جس نے چیزوں کی قیمتیں گرا دی تھیں۔ اس لئے یہی مشین تھی جو اسکی دشمن تھی جب یہ دل شکستہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچ گئے تو پھر دوسرا قدم اٹھنے میں کیا دیر تھی۔

دوسرا قدم کیا تھا۔؟ مشینوں سے انتقام۔ مشینوں کی توڑ پھوڑ۔

فیتے بنانے کے فریم۔ موزے اور بنیائیں بننے کے جو کھٹے، بننے والی مشینیں کاتنے والی کلیں سب توڑ ڈالی گئیں، وہ تمام مشینیں جو ان کے نزدیک انکی تباہی کا سبب بنی ہوئی تھیں۔ ان کے جوش انتقام کا شکار ہوئیں۔ انھوں نے انکو توڑا۔ جلایا اور برباد کیا۔ مشینوں کے یہ توڑنے والے جن کو لڈائٹ[1] کہتے تھے، زندگی کا ایک نیا معیار حاصل کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے۔ اپنے دلوں میں عرصہ سے جو غم و غصہ چھپائے ہوئے تھے اب وہ یکبارگی ظاہر ہوگیا تھا وہ یہ جنگی گیت گا گا کر اپنے انتقام کی آگ بجھاتے جاتے تھے۔

"ہم کندھا جوڑ کر کھڑے ہونگے۔
اور ہم سختی سے قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم
کترنیوں کو توڑ ڈالیں گے اور کھڑکیوں کو بھی

---

۱ LIDDITE = کاریگروں کی ایک جماعت کا رکن جس نے ۱۸۱۱ء میں مشینوں کے غرض سے بلوہ کیا تھا۔

اور ہم آگ لگا دیں گے ـــــ مل کو "

ہم آسانی سے یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اس تشدد کا نتیجہ کیا ہوا ہوگا۔ املاک پر تباہی آئی اور غضبناک مجمعوں نے مشینوں کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جو لوگ ان مشینوں کے مالک تھے انھوں نے بھی ان ہنگاموں کے علاج میں دیر نہیں لگائی۔ انھوں نے قانون کا سہارا لیا۔ قانون نے بھی انکی مدد میں کوتاہی نہیں کی ۱۸۱۲ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے سے مشین کے توڑنے والوں کو سزائے موت کی وعید سنائی۔ اس قانون کے منظور ہونے سے پہلے دارالامراء کے ایک رکن نے اپنے دورِ ممبری کی پہلی تقریر میں اس قانون کی سخت مخالفت کی اس نے کہا کہ مشینوں کی تباہی کی اصل ذمہ داری ان حالات پر عائد ہوتی ہے جو انسانی تباہی کا موجب ہو رہے ہیں:۔

"اس میں کوئی شبہ نہیں یہ تشدد پریشان کن حد تک آگے بڑھ گیا ہے۔ لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ ان حالات کا نتیجہ ہے جو ایسی زبردست تباہی کا موجب ہو چکے ہیں جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکے گی ان تباہ حال لوگوں کا اپنی اس روش پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ انکی تباہی ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی ہے اور اب ان ہنرمند اور ایماندار محنت کشوں کی جماعتیں مایوسی کے عالم میں اس تشدد کے سوا جوان کے اور انکے خاندان والوں کے لئے سخت تباہ کن ہے اور کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں پاتی ہیں ـــــ وہ اپنی نادانی سے خیال کرتے ہیں کہ ہنرمند غریبوں کی فلاح و بہبود ان تجارتی آلوں کی ترقی کے مقابلے میں جو صرف مٹھی بھر امیروں کی دولت بڑھانے کا موجب ہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے۔ وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان تجارتی آلوں نے ان سے روزگار چھین لیا ہے۔ اور صرف انکی وجہ سے محنت کشوں کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا ہے . . . . . .

آپ ان لوگوں کو جاہل، خطرناک اور شورہ پشت عوام کہتے ہیں۔ کیا ہمیں ان ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے جو ان عوام کے بارے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں؟ یہ عوام ہی ہیں جو ہمارے فارموں میں کام کرتے ہیں۔ جو ہمارے بحری بیڑے اور ہماری فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ یہ عوام ہی ہیں جن کی مدد سے آپ پوری دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ عوام ہی ہیں جن کو ہماری غفلتیں تباہ کر کے مایوسی کی حد تک پہنچا دیں۔ تو وہ ہمارا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں۔"

جس شخص نے ۲۸ فروری ۱۸۱۲ء کو یہ تقریر کی تھی وہ لارڈ بائرن کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ مشینوں کی توڑ پھوڑ کی تحریک کوئی معقول تحریک نہ تھی ـــــ اگر یہ کامیاب بھی ہوتی تو کوئی نتیجہ نہ نکلتا۔ اور محنت کش عوام کے مسئلے جوں کے توں لاینحل پڑے رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے صحیح راہ عمل اختیار نہیں کی تھی۔ مشینیں انکی تباہی کا سبب نہیں تھیں۔ ان کی تباہی کے ذمہ دار تو ان مشینوں کے مالک تھے۔ ان مشینوں کے مالکوں ہی نے کھلم کھلا نہ سہی لیکن ایسے ذرائع استعمال کئے جو احاطہ بندی کی تحریک کی طرح انکی تباہی کے موجب ہو رہے تھے:۔

مزدوروں کی سمجھ میں بہت جلد یہ بات آگئی کہ مشینوں کی توڑ پھوڑ سے اصل مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ بعض مزدوروں نے دوسری تدبیریں بھی آزمانی شروع کیں نیچے ہم ایک عرضداشت کی نقل پیش کرتے ہیں۔ یہ درد بھری درخواست غریب پارچہ بافوں نے ۱۸۱۸ء میں اپنے مالکوں کے سامنے پیش کی تھی:۔

"ہم اس شہر اور آس پاس کے پارچہ باف بہت ادب سے آپ کی توجہ اپنے حال زار کی طرف جس میں ہم عرصے سے گرفتار ہیں مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ہماری پریشانی کی اصل وجہ ہماری اجرت کی انتہائی کمی ہے۔ اس لئے آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ اپنا ایک جلسہ طلب کریں اور کوشش کریں کہ ہماری اجرتوں میں کچھ اضافہ ہو جائے تاکہ ہماری پریشانیوں میں کچھ کمی ہو۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم موجودہ حالت میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری اور عام چیزیں بھی فراہم نہیں کر سکتے۔ ہمیں امید ہے کہ اگر آپ جماعتی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کریں تو آپ کے نفع کو نقصان پہنچے بغیر حالات درست ہو جائیں گے ہم کبھی اور کسی حال میں نہیں چاہتے کہ آپ کے مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہنچے"

اس قسم کی سیکڑوں عرضداشتیں مالکوں کے سامنے پیش کی گئیں۔ لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر کار یہ طریقہ ترک کر دیا گیا اور براہ راست پارلیمنٹ کے سامنے درخواستیں پیش ہونے لگیں۔ بہت سی عرضداشتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض شکایتوں نے ایوان کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ قوانین کے رجسٹر میں بعض ایسے قوانین پہلے سے درج چلے آرہے تھے۔ جن پر اگر عمل ہوتا رہتا تو اس محنت کش طبقے کی مصیبتوں کا علاج ہو چکا ہوتا۔ بعض قانون ساز کمیٹیوں نے بھی تحقیقات کے بعد یہی کہا تھا کہ محنت کشوں کے حالات ناقابل بیان حد تک بھیانک ہیں اور ان حالات کی فوری اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ ان عرضداشتوں اور ان رپورٹوں کی وجہ سے کچھ اور قوانین بھی بنے۔

لیکن قوانین کا کتاب القوانین (STATUTE BOOKS) میں چھپ جانا اور بات ہے اور ان پر عمل ہونا دوسری بات ہے۔ مزدوروں کی سمجھ میں بھی یہ حقیقت آنے لگی تھی۔ ان کو یہ بھی تجربہ ہو رہا تھا کہ وہی قوانین ایک خاص طریقے سے ان کے حق میں بھی استعمال کئے جا سکتے ہیں لیکن انکی تعبیر بدل کے دوسرے انداز سے وہ، کارخانے کے مالکوں کے بھی کام آسکتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مزدور جن مالکان کارخانہ کے خلاف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے کرسیِ عدالت پر وہی جلوہ افروز نظر آتے تھے ان حالات میں انکو اپنی فریاد کی بے اثری کا پہلے سے یقین ہو جاتا۔ یہ بات بھی کچھ کم نہ تھی کہ عدالت کے حاکم بھی مالکان کارخانہ کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے اگر ان کا اس طبقے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تب بھی ان کے طرز فکر کی یکسانیت انصاف کے خون کیلئے کافی ہوتی تھی۔ محنت کش عوام ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اور مالکان کارخانہ سماج میں بڑی عزت کے مالک تھے۔ عدالتوں کے حاکموں کے نزدیک مزدوروں کو ان چند ٹکڑوں کے لئے جو مالک ان کے سامنے پھینک دیتے تھے اس مخصوص ماحول میں انصاف کا ترازو ہمیشہ سرمایہ داروں کی طرف جھکتا تھا اور مزدوروں کو اپنے کئے کا بھگتان بھگتنا پڑتا تھا۔ دو مشہور مورخوں نے جو واقعات پیش آرہے تھے ان کا خلاصہ دیا ہے کہ:۔

"پارلیمنٹ محنت کش طبقے کے مطالبات منظور نہیں کرتی ہے۔ جو رعایتیں ان کو دی جا چکی ہوں وہ بھی انھیں عملاً نہیں ملتی ہیں۔ حاکمان عدالت ان قوانین پر جو مالکوں کے مفاد کے خلاف ہوں عمل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان مجسٹریٹوں کا خیال ہے کہ اگر مالکوں کا طبقہ کسی قانون پر عمل کرنے سے، انکار کر دے گا تو ان کو کسی طرح قانون کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جا سکے گا۔ وہ مالکوں کو قانون کے احترام پر مجبور کرنے

سے قاصر تھے ۔ اس لئے جو شخص ان مالکوں کو ان قوانین پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنا چاہتا تھا ۔ وہ اسے اس جرأت کی پاداشں میں جیل خانے میں بند کر دیتے تھے ۔"

آدم اسمتھ جسکو قدرت نے بڑی نکتہ رس نگاہ عطا کی تھی یقین کرتا تھا کہ یہ حالات کسی خاص زمانے اور کسی خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ عام طور سے تمام سرمایہ دار ملکوں میں ہر زمانے میں پیش آتے رہتے تھے ۔ مالکان کارخانہ جو اپنے کارناموں کی داد کے لئے اپنے اس ہیرو کی طرف دیکھ رہے تھے کچھ زیادہ عرصہ تک ادھر متوجہ رہنے میں اپنا منافع نہیں سمجھتے تھے ۔ وہ "قوموں کی دولت" کے اس پیرے سے اپنی نگاہ بچاکر کترا جانا چاہتے تھے :-

"جہاں تک جائداد اور املاک کی حفاظت کا سوال ہے شہری حکومتیں دراصل صرف غریبوں کے خلاف امیروں کی حفاظت کے لئے قائم ہیں ۔ یہ صرف انکو جو جائداد اور املاک رکھتے ہیں غریبوں سے جن کے پاس کچھ نہیں ہیں بچاتی ہیں ۔"

یہ حقیقت اب بڑے تلخ تجربوں کے بعد اب محنت کشوں کی سمجھ میں آنے لگی تھی ۔ وہ اس صورتحال کا کیا علاج کرتے ۔؟ ایک تدبیر جو بظاہر بہت مناسب معلوم ہوتی تھی ان کی سمجھ میں آئی ۔ اگر وہ رائے دہندگی کا حق حاصل کر سکتے تو بڑا کام چل جاتا ۔ وہ اس لائق ہو سکتے کہ قانون سازوں پر دباؤ ڈال کر ایسی حکومت بنالیں جو چند افراد کے بجائے بہتوں کے مفاد کے لئے کام کر سکے ۔ وہ اب محسوس کر رہے تھے کہ انہیں قانون سازوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق لینے کی ضرورت تھی ۔ جو قانون محنت کشوں کی رائے سے بنے گا وہی ان کے حقوق کی نگہداشت کر سکے گا ۔ لیکن اس وقت کے مروجہ قوانین انکی راہ کے پتھر بنے ہوئے تھے ۔ یہ قوانین ان کے مالکوں کے بنائے ہوئے تھے اگر مزدور قانون ساز جماعت پر اثر ڈال سکتے تو انکی بہبودی کے مواقع نکل سکتے تھے ۔ اگر حکومت غلہ فروشی کے قوانین بناکر زمین کے مالکوں کے مفاد کی حفاظت کر سکتی ہے ۔ اور اگر بیرونی مال پر محصول لگاکر کارخانے کے مالکوں کے حقوق کی نگہداشت ہو سکتی تھی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایسے قوانین بناتی جن کی مدد سے مزدوروں کی اجرت اور ان کے کام کرنے کے اوقات کے مسئلوں کو بھی ہمدردی سے حل کیا جا سکتا اب انھوں نے حق رائے دہندگی کے حصول کے لئے اپنی مہم شروع کی :-

ہم لوگ جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور انگلستان کے باشندے ہیں یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی جمہوریت جیسی آجکل قائم ہے دنیا میں ہمیشہ قائم رہی ہے لیکن یہ یقین حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا ہے ۔ رائے دہندگی کا حق جو آجکل امریکہ اور یورپی ممالک میں ہر شہری کو حاصل ہے آسانی سے نہیں ملا تھا ــــ یہ حق بھی نتیجہ ہے ایک سخت کشاکش کا ۔ انگلستان کے محنت کشوں نے تحریک منشوریت[1] میں شریک ہو کر اپنی صف بندی کی ۔ تحریک منشوریت کے مطالبات حسب ذیل تھے ۔

۱:۔ رائے دہندگی کا عالمگیر حق (مردوں کیلئے)

۲:۔ ممبران دارالعوام کے لئے الاؤنس (تاکہ غریب لوگ بھی عہدہ سنبھال سکیں) ۔

۳:۔ پارلیمنٹ کی سالانہ نشست ۔

۴:۔ امیدواروں کے لئے جائداد کی قید سے استثناء ۔

۵:۔ بیلٹ کے ذریعہ رائے شماری تاکہ بیجا تخویف اور دباؤ سے بچا جا سکے ۔

۶:۔ برابر انتخابی حلقے ۔

تحریک منشوریت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ یہ سارے مطالبات (پارلیمنٹ کی سالانہ نشست کے علاوہ) ایک ایک کر کے منظور کر لئے گئے منشوری رہنماؤں نے سیاسی جمہوریت کے لئے جدوجہد کی تھی ۔ ان کا خیال تھا کہ اس ہتھیار کے ہاتھ میں آجانے کے بعد حالات کی بہتری کے لئے جدوجہد کامیابی کے ساتھ جاری رکھی جا سکے گی ۔ اسٹیفنس نے جو میتھوڈسٹ تھا اپنے سامعین سے کہا تھا :-

"میرے دوستو منشوریت کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے اس تحریک کا خاص مقصد بیلٹ حاصل کرنا ہے ۔ منشوریت نام ہے شکم سیری کی تحریک کا ، اچھے گھر ، عمدہ کھانے پینے ۔ خوشحالی اور کام کے گھنٹوں میں کمی کرانے کا نام ہے ۔"

پارسن اسٹیفنس رجائیت پسند آدمی تھا ۔ محنت کش طبقے نے سیاسی جمہوریت کی لڑائی تو جیت لی لیکن اسٹیفنس کے خواب کی تعبیر نہ نکلی ۔ سیاسی جمہوریت سے جن پھلوں کی وہ امید کرتا تھا وہ حاصل نہ ہوئے ۔ آگے چل کر کچھ مانگیں ضرور پوری ہوئیں ۔ لیکن ان کے حصول میں صرف حق رائے دہندگی سے کوئی مدد نہ ملی ان محنت کشوں کے مطالبات کے تسلیم کرانے میں خود انکی انجمن ــ ٹریڈ یونین ــــ کا جو ان کے حقوق کے لئے لڑ رہی تھی بڑا ہاتھ تھا اس انجمن نے لڑ بھڑ کر اجرتوں میں اضافہ کرایا ۔ کام کے اوقات میں کمی کرائی اور مزدوروں کے لئے بہتر ملازمت کی بہتر شرطیں حاصل کیں ۔

ٹریڈ یونین کوئی نئی چیز نہ تھی ۔ پرانے زمانے میں اجیر کاریگروں کی انجمنیں قائم تھیں ۔ یہی انجمنیں اپنی نئی شکل میں ڈھل کر ٹریڈ یونین کے نام سے مشہور ہوئیں ۔ جب صنعتوں میں سرمایے کی حیثیت بہت بڑھ گئی ، کاریگروں کی انجمنوں نے بھی گلڈ سسٹم کا پرانا چولا اتار کر موجودہ ٹریڈ یونین کا لبادہ پہن لیا ۔ آجکل کی ٹریڈ یونین ایک ایسی جماعت ہے جو ایک صنعت کے تمام مزدوروں کو اپنے مشترکہ مفاد کی حفاظت کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کرنا سکھاتی ہے ۔

یہ ٹریڈ یونینیں یکبارگی نہیں بن گئیں ۔ طبقاتی مفاد کے اتحاد اور یکسانیت کا احساس بہت دنوں میں پیدا ہوا جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوتا طبقاتی بنیادوں پر کسی بڑی جماعت کا منظم کرنا ممکن نہ تھا ۔ صنعتی انقلاب نے یہ منزل کھول دی اور ٹریڈ یونین کی تحریک دیکھتے ہی دیکھتے بہت آگے بڑھ گئی ۔ صنعتی انقلاب کا زمانہ ان جماعتوں کی تنظیم کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا ۔ صنعتوں نے مزدوروں کی بڑی بڑی بستیاں شہروں میں بسا دیں ۔ نقل وحمل اور رسل و رسائل کی آسانیاں ایک بڑی قومی تنظیم کے لئے لازمی ہیں ، مزدوروں کی تحریک بھی اپنی تنظیم کے لئے ان تمام آسانیوں کی محتاج تھی ان آسانیوں کے ملتے ہی محنت کشوں کی تنظیم نے بھی ترقی کی منزلیں بہت جلدی طے کر لیں ۔

محنت کشوں کی تنظیم بھی سرمایہ داری نظام کی ترقی اور ہمہ گیری کے ساتھ بڑھتی گئی ۔ سرمایہ داری نظام نے طبقاتی تفریق کچھ زیادہ واضح کر دی طبقاتی جذبات نے بھی بڑھ کر الگ الگ طبقوں کی حدبندی کر دی اور ملنے جلنے اور اشتراک عمل کی مادی آسانیوں نے راہ کی دشواریوں کو بڑی حد تک آسان کر دیا ٹریڈ یونین کی تحریک بھی انھیں ملکوں میں زیادہ ترقی پر ہے جو صنعتی ترقی میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں ۔ اور جہاں فیکٹری سسٹم نے بڑے بڑے شہر بسا دیئے ہیں فریڈرک اینگلز نے ۱۸۴۴ء میں اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں رہنمائی کی تھی :-

"اگر آبادی کا ایک مرکز پر اکھٹا ہو جانا املاک رکھنے والے طبقے میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اسکو ترقی دیتا ہے تو وہ محنت کش طبقوں میں بھی ترقی کی رو بہت تیز کر دیتا ہے مزدور بھی ایک طبقے اور ایک جماعت کی حیثیت سے سوچنا

---

[1] منشوریت (CHARTISM) ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۸ء کی اصلاحی تحریک کے اصول ۔

اور محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں اور خیال کرنے لگتے ہیں کہ اگرچہ وہ فرد کی حیثیت سے بہت کمزور ہیں لیکن اگر یہ متفق ہو جائیں تو ایک طاقت بن جاتے ہیں بورژوا طبقے سے انکی علیٰحدگی عمل میں آتی ہے اور وہ خیالات پرورش پاتے ہیں جو محنت کش طبقوں اور انکی جیسی حالت رکھنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں پسماندگی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور یہ محنت کش سماجی اور سیاسی طور پر ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتے ہیں ۔ بڑے شہر مزدوروں کی تحریک کا جنم استھان ہیں ۔ ان بڑے شہروں میں وہ سب سے پہلے اپنی حالت پر غور کرتے ہیں اور اس سے نکلنے کی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح پرولتاری اور بورژوا طبقوں میں مخالفت اپنی پہلی جھلک دکھاتی ہے یہی منزل ہے جہاں سے ٹریڈ یونین، منشوریت اور اشتراکیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں ۔"

صنعتی انقلاب جو سب سے پہلے انگلستان میں شروع ہوا تھا دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا ۔ جو ملک ابھی تک بچے ہوئے تھے ان کی طرف بھی یہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہا ہے ۔ یہ انقلاب ہر ملک میں انگلستان کے نقش قدم پر نہیں چلا امیروں کے برتاؤ اور حکومت کے اصلاحی قوانین نے اسکی رفتار اور ظاہری شکل میں بہت تغیرات پیدا کئے لیکن ٹریڈ یونین کی مخالفت میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جس نے انگلستان کی پیروی نہ کی ہو ۔

یہ لڑائی بہت پرانی ہے ، محنت کشوں کا اپنی حالت سدھارنے کیلئے منظم ہونا ہر زمانے میں جرم خیال کیا گیا ۔ چودھویں صدی عیسوی میں بھی مزدوروں کی باہمی تنظیم ، خلاف قانون قرار دی گئی تھی ۔ اور اس کے بعد تو ہر صدی نے انکی جماعت بندی کو جو وہ صرف اپنی جماعتی فلاح وبہبود کے لئے کرتے تھے گناہ خیال کیا ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے لکھا :-

"مزدور کی عام اجرت ہر جگہ اس معاہدہ پر منحصر ہے جو دونوں جماعتوں کے درمیان انجام پاتا ہے ۔ یہ دونوں جماعتیں دو طرح کے مفاد رکھتی ہیں ۔ اور ان دونوں میں اشتراک مقاصد کا کوئی امکان نہیں ہے ۔ مزدور چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کرے ۔ لیکن مالک سے جہاں تک بن پڑتا ہے اجرت کی شرح کم سے کم تر رکھتا ہے ۔ مزدور اپنی جماعتی تنظیم کرتے ہیں تاکہ اجرت کی شرح بڑھا سکیں ۔ اور مالک متحد ہوتے ہیں تاکہ یہ شرح جتنی کم کی جا سکے کر لی جائے ۔

یہ اندازہ لگانا کہ اس مقابلے میں کس جماعت کو کامیابی نصیب ہوتی ہے زیادہ دشوار نہیں ہے ۔ مالک تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے آسانی سے منظم ہو سکتے ہیں اور ، قانون بھی انکو اسکی اجازت دیتا ہے اور اگر اجازت نہیں دیتا ہے تو کم از کم تنظیم سے تو منع نہیں کرتا ہے لیکن مزدوروں کو یہ رعایت بھی حاصل نہیں ہے ۔ پارلیمنٹ نے کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا ہے جو محنت کی اجرت کو کم کرنے سے منع کرتا ہو ۔ لیکن ایسے بہت سے قوانین موجود ہیں جو مزدوروں کو متفق ہو کر اپنی اجرت بڑھانے سے روکتے ہیں ۔"

آدم اسمتھ نے ۱۷۷۶ء میں جو لکھا تھا وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہر سرمایہ دار ملک میں پیش آ رہا ہے ۔ جن ملکوں میں مالک کارخانہ داروں اور محنت کش مزدوروں کو اپنی انجمنیں بنانے کی اجازت نہ تھی وہاں بھی قانون کی تلوار مالکوں کے سروں پر بہت کم اور غریبوں کے سروں پر اکثر چمکتی رہتی تھی ۔ انگلستان ۔ فرانس ۔ جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قانون کا پہیہ صرف ٹریڈ یونینوں کو کچلتا رہتا ہے ۔

چوتھائی صدی تک انگلستان میں ان قوانین نے جو جماعت بندی کے خلاف بنائے گئے تھے مزدوروں کو منظم ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت سے باز رکھا جب انھوں نے انجمنیں بنائیں ۔ قانون نے ان کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں دیر نہیں لگائی

"اسٹاکپوٹ کے ۹ ٹوپی بنانے والوں کو ۱۸۱۶ء کی سازش کے سلسلے میں دو سال قید کی سزا دی جاتی ہے ۔ جج سر ولیم گیرو نے مقدمہ کی روداد کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ "اس بھلے ، بھولے ملک میں جہاں قانون ایک ارذل طبقے کے آدمی کو بھی ایک بہت اونچے طبقے کی ممتاز شخصیت کے ساتھ مساوات عطا کرتا ہے اور جہاں ہر طبقے کی برابر حفاظت کی جاتی ہے انجمن بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مسٹر جیکسن جنھوں نے سو سے لے کر ایک سو بیس آدمیوں تک کو نوکری دے رکھی ہے ہم سب کے شکریئے کے مستحق ہیں اور یہی جذبۂ شکرگزاری ہم کو سکھاتا ہے کہ ہم اس محسن قوم کی عزت کریں ۔"

ٹوپیاں بنانے والوں کو جنھوں نے یونین میں شریک ہونے کی جرأت کی دو سال کی سزا اور جنھوں نے از راہ کرم ومہربانی ان کو کام کا موقع دیا تھا ہدیۂ شکر و احترام ۔ جج کے پہلے جملے پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ کیا اس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اسکی مراد بھی وہی ہے ؟

فرانس اور انگلستان میں اجرت کی شرح بڑھانے کی نیت سے انجمنیں بنانا خلاف قانون قرار دے دیا گیا ۔ اور ججوں کو ان محنت کشوں کے حال پر افسوس کرنے کا موقع ملا جو قانون کی بے حرمتی پر اصرار کر رہے تھے ۔ لوکیسر کا بیان ہے کہ ان ملکوں میں محنت کشوں کو اپنی باہمی تنظیم سے روکا گیا لیکن مزدوروں کی سمجھ میں یہ حقیقت اچھی طرح آ گئی تھی کہ وہ الگ کوئی اثر نہیں رکھتے لیکن متفق ہو کر زبردست طاقت بن جاتے ہیں اس لئے انھوں نے ان قوانین کی پرواہ کئے بغیر اپنی تنظیم کی فکر کی ۔-

"ججوں نے سزائیں دیں اگرچہ انھوں نے (بزعم خود) ہر معاملے میں قانون کا احترام پوری سختی سے نہیں کیا ۔ انھوں نے کہا کہ "عدالت نے بہت نرمی اور شفقت سے تمہارے معاملات پر غور کیا ہے ۔ لیکن تم کو اس سے سبق لینا چاہیئے اور خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ جس طرح کام تم کو آرام اور نیک سلوک کا مستحق قرار دیتا ہے اسی طرح یہ گٹ بندی تم کو قید اور افلاس کا سزاوار ٹھہراتی ہے ۔"

"لیکن محنت کشوں نے کوئی سبق نہیں حاصل کیا ۔ ان واقعات کی جو یاد ان کے ذہنوں میں محفوظ رہ گئی وہ صرف یہ تھی کہ ۱۸۲۲ء کی اسٹرائیک نے انکی اجرت کی شرح بڑھا کر ۴۰ سنٹم کر دی اور انھوں نے ۱۸۴۵ء میں اس لئے ہڑتال کی تھی کہ انکی مزدوری کی شرح پچاس سنٹم ہو جائے ۔"

جرمنی میں بھی مزدوروں کا عقیدہ یہی تھا کہ ٹریڈ یونین نے ان کو وہ طاقت بخشی جس کے بغیر وہ اپنی حالت سدھار نہیں سکتے تھے ۱۸۴۶ء میں برلن کے چھاپنے والوں نے پرشین چیمبر ڈپٹیز سے درخواست کی تھی کہ :-

"ہم پوری طرح یقین کرتے ہیں کہ مزدوروں کی سماجی حالت میں ترقی اسی وقت ممکن ہے جب وہ تمام پابندیاں جو موجودہ قانون نے عائد کر رکھی ہیں اٹھالی جائیں اسی لئے ہم چھاپنے والے اجیر کاریگر یہ عرضداشت پیش کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے کہ معاشیات کا قانون طلب اور رسد مزدوروں کو اتنا بھی نہیں دلاتا جس سے وہ اپنی زندگی کی موٹی موٹی ضرورتیں پوری کر سکیں کوئی محنت کش فرد اپنی انفرادی حیثیت سے اس لائق نہیں ہے کہ اپنی اجرت کی شرح میں اضافہ کرا سکے۔ اس لئے ہم جماعت بندی کا حق مانگتے ہیں، ہمارا یہ حق عقل اور انصاف کی رو سے بالکل جائز اور درست ہے۔ اس لئے ۱۸۲۴ء کا قانون جو مزدوروں کو تنظیم سے روکتا ہے منسوخ کر دیا جائے۔"

یہی داستان ہر جگہ دہرائی گئی۔ مزدور ہر جگہ اپنی تنظیم کے حق کے لئے لڑتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ انکو مل جل کر اپنی دشواریاں حل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم میتھوڈسٹ فیڈریشن کی رپورٹ سے جو اس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سماجی خدمات کے متعلق ۱۹۳۵ء میں پیش کی تھی دو اقتباسات پیش کرتے ہیں ان سے پتہ چل جائے گا کہ امریکہ میں بھی ٹریڈ یونین کا حق حاصل کرنے کے لئے کتنی بھیانک لڑائی لڑی گئی تھی:۔

"۔۔۔۔۔۔ ایک بہت بری اور بھیانک تحریک یونین کے ممبروں کے خلاف شروع کی گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہر روز ایک برقعہ پوش گروہ کے ممبر کسی نہ کسی ممبر کو پیٹتے رہتے ہیں پہلا شخص جوان کی بدسلوکی کا شکار ہوا شہر سے ۱۵ میل دور لے جایا گیا۔ وہاں حملہ آوروں نے اس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا۔۔۔۔ ۔۔۔ آج پانچ آدمیوں کو بری طرح پیٹا گیا۔ سب سے آخر میں یونین کی ایک شاخ کے صدر کو مارا گیا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ اس پورے ریکارڈ سے یہ اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ملک میں امیروں اور غریبوں کے درمیان کشاکش بدترین شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ کم سے کم تہتّر مزدور معاشی ہنگاموں اور خلاف قانون سزائے موت کا شکار ہوئے ہیں۔۔۔۔ لیکن کسی مالک کا بال بیکا نہیں ہوا۔"

لیکن ان تمام آئینی اور غیر آئینی تدبیروں کے باوجود جو ٹریڈ یونین کی تحریک کو کچلنے کے لئے اختیار کی گئیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ٹریڈ یونین کی بنیادیں مستقل طور پر جمتی گئیں۔ اس تحریک کو فنا کرنا آسان نہیں تھا۔ یونین کے ممبروں کو قیدخانوں میں ڈالا گیا۔ اس کے فنڈ پر قبضہ کیا گیا اور یونینیں چھپ چھپ کر کام کرنے پر مجبور کی گئیں۔

انھوں نے رفاہ عام کی انجمنوں اور سوشل کلب کے نام سے اپنی زندگی بچائی۔ یونین کی لڑائی کے ہتھیار (اسٹرائیک کرنا اور دھرنا دینا) بیکار کر دیئے گئے۔ لیکن ٹریڈ یونینیں پھر بھی زندہ رہیں اور اب بھی وہ مزدوروں کا سب سے زیادہ موثر ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ وہ اونچا معیار رہائش حاصل کرنے کیلئے جد وجہد کر رہے ہیں۔

انگلستان کے مشہور اور بڑے شاعر شیلے نے سو سال سے بھی کچھ زیادہ ہوئے ایک نظم کہی تھی اس کا عنوان ہے۔

"انگلستان کے باشندوں کے نام"

وہ اس نظم میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان کی جو حالت ہو گئی تھی اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہ نظم پورے مضمون کا خلاصہ قرار دی جا سکتی ہے شیلے کہتا ہے:۔

"انگلستان کے باشندو! تم کس کیلئے زمین جوتتے ہو؟
اس مالک کے لئے جو تمہاری پستی اور تباہی کا ذمہ دار ہے!
کیا تم اس لئے محنت اور ہنرمندی سے کپڑے بنتے ہو
کہ ظالم دولتمند اس کے کپڑے بنا کر پہنیں۔
تم کس کے لئے مہد سے لے کر لحد تک کھلاتے، پہناتے
اور بچاتے رہتے ہو
ان ناشکرے مفت خوروں کو
جو تمہارا پسینہ نہیں خون چوستے ہیں؟"
"اے انگلستان کی شہد کی مکھیو! تم کیوں اپنے
بہت سے ہتھیار اور زنجیریں ڈھالتی ہو تا کہ یہ
بے ہتھیار کے مفت خورے کاہل تمہاری
محنت کی گاڑھی کمائی کو برباد کر دیں؟"
"کیا تم بھی آرام، سکون اور اطمینان پاتے ہو
ٹھنڈا سایہ، غذا اور محبت کی نرم اور بھینی خوشبو؟
وہ چیز کیا ہے جو تم اتنی مہنگی خریدتے ہو
اس قدر مصیبت اور خطرات برداشت کر کے؟"
"تم جو بیج بوتے ہو دوسرے کاٹتے ہیں
تم جو دولت ڈھوتے ہو اسے دوسرے بٹور لے جاتے ہیں
تم جو لباس بنتے ہو اسے دوسرے پہن ڈالتے ہیں
تم جو ہتھیار ڈالتے ہو اسے دوسرے اٹھا لے جاتے ہیں"
"بیج بو مگر کسی ظالم کو اپنی فصل کاٹنے نہ دو
دولت پیدا کرو مگر کسی مکار کو لوٹ کر اکھٹا نہ کرنے دو
کپڑے بنو مگر کاہلوں کے پہننے کیلئے نہیں
ہتھیار ڈھالو لیکن صرف اپنی حفاظت کے لئے"

(**سرمایہ داری** کے حامی ماہرین معاشیات سے خطاب کرتے ہوئے) مریض چیچک میں مبتلا ہے اور تم اس کے ہر ہر دانے کا علاج کر رہے ہو ——— **آسکو امرینگو**

قدروت کی معاشیات میں تاجروں نے اپنی جگہ صرف منافع کمانے کے لئے بنائی ہے چیزیں پیدا کرنے کے لئے نہیں، تجارت کا کمال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع بٹورا جائے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جس کا خاص مقصد منافع اندوزی نہ ہو۔ تجارت کا نفع صنعتی پیداوار کی راہ سے آتا ہے۔ صنعتیں آزاد نہیں ہیں ان کی رفتار صرف نفع کی امید پر تیز اور سست کی جاتی ہے ——— **تھارسٹن وبلن**

جب ہم کسی نااہل کو دیکھتے ہیں جو ہمارے برابر ذہنی صلاحیت اور سخت کام کرنے کی جسمانی طاقت نہیں رکھتا ہے، لیکن بنا ٹھنا عیش و عشرت کی زندگی گزارتا پھرتا ہے تو ہمارا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے ——— **لیوھیوبومین**

واحد بشیر



یہ عنوان نہ تو ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کے لئے ہے نہ جذبۂ استعجاب و تجسس کو بیدار کرنے کے لئے نہ تو صنعت تضاد کا استعمال نہ سنسنی خیزی کی کوشش بلکہ ایک امر واقعہ ایک ناقابل تردید حقیقت ایک زندہ صداقت کا اظہار ہے۔

راقم الحروف کو نہ عمرانیات پر عبور کا دعویٰ نہ معاشیات میں مہارت کی خوش فہمی یہ تو بس ایک کوشش ہے اپنے گردوپیش کا مشاہدہ کرنے، انھیں ذہن میں محفوظ رکھنے اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے رشتہ تلاش کرکے ایک لڑی میں پرونے یا کڑی سے کڑی جوڑنے کی۔ اس گفتگو میں ممکن ہے معاشیات کی بات آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سلسلہ سیاست سے جا ملے۔ بہرحال یہ گفتگو عامی کی عامیوں سے ہے اہل علم سے ان کی وسیع القلبی کی بنیاد پر توقع ہے کہ فروگزاشتوں کو نظر انداز کرکے صحیح سمت میں رہنمائی فرمائیں گے۔ اور خواص؟ شاید، وہ کبھی ان مجذوبانہ باتوں کو اہمیت نہ دیں گے۔

ان سخن گسترانہ باتوں کو جانے دیجئے۔ چلئے پھر عنوان کی طرف سنتے آئے ہیں کہ زبردست مارے اور رونے بھی نہ دے۔ آج اسی کہاوت کو جھوٹ ثابت کرنی ہے اس لئے کہ کمزوروں نے زور آوروں کا روپ دھار رکھا ہے۔ بہ الفاظ دیگر گدھا شیر کی کھال پہنے بستی والوں کو ڈرا رہا ہے اور وہ سہمے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھے ہیں یا اپنی ذات کے تہہ خانے میں پناہ گزیں ہیں (جدید "وجودی" معاف فرمائیں) بات سے بات نکلی جا رہی ہے اور عنوان کی پہیلی بوجھنی باقی ہے۔ اب پتہ شاید اس شعر سے مل جائے ؎

جس کے زور بازو سے رونقِ زمانہ ہے
جو عظیم طاقت ہے ظلم کا نشانہ ہے

خیر چھوڑیئے بجھارتوں میں کیا رکھا ہے۔ سیدھے سادھے آدمیوں کی سیدھی سادھی زبان میں تذکرہ ہے اس طبقے کا جس کی محنت تمام علم و ادب تہذیب و ثقافت کی خالق ہے جو پیدا کرتا ہے۔ مگر علم و دانش، تہذیب و ادب تو دور کی بات رہی خود اپنی محنت کے پھل سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ یہ طبقہ کئی گروہوں میں تقسیم ہے اور شاید اسی تقسیم کی وجہ سے وہ طاقت کا سرچشمہ ہونے کے باوجود مظلوم ہے۔

ہم شہروں کے باسی اور خاص طور پر سفید پوش زندگی کے منجدھار میں کچھ ایسے گھرے ہوئے ہیں کہ اکثریت کے سامنے جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے یعنی اپنے وجود کو برقرار رکھنے اور اس کی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ اور کوئی بات اہم نہیں ہے اس کائنات کا نظام برقرار رکھنے کے لئے بنیادی ضرورت پیسے کی ہے اور محنت سے اتنا کما لینا کہ چین سے بسر ہو جائے موجودہ سماجی نظام کے اصول کے خلاف ہے۔ قصہ مختصر روٹی، روزگار کے چکر سے اتنی فرصت ہی نہیں کہ اس محدود دائرے سے باہر نظر کی جائے مگر انسان فطرتاً اجتماعیت پسند ہے ماحول لاکھ اسے انفرادی زندگی کی چہار دیواری میں محدود رکھنے کی کوشش کرے وہ ان دیواروں کو پھلانگ ہی جاتا ہے۔ اپنے گردوپیش سے دلچسپی لیتا ہے اور اسے سدھارنے سے متعلق سوچتا ہے سوچ جو عمل کی بنیاد اور اس طرف پہلا قدم ہے۔

قومی زندگی سے باخبر رہنے کا ایک وسیلہ اخبار ہیں۔ اس ذریعہ سے محنت کش طبقے کے ایک گروہ یعنی صنعتی مزدوروں کی زندگی، ان کے کام کے حالات، اور ان کی جدوجہد کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آ جاتی ہے صنعتی مزدور کی زندگی کی یہ تصویر جسے بہت بنا سنوار کر پیش کیا جاتا ہے اتنی دردناک ہے کہ انسان اس سے نفرت کرنے پر مجبور ہے۔ وقت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ صنعتی مزدوروں کے حالات کار کا تفصیلی اور حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے لیکن اس میں کئی مشکلات ہیں۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ قومی وسائل سو فیصدی اس گروہ کے ہاتھ میں ہیں جو ایک حقیر ترین اقلیت ہونے کے باوجود بھی وسائل پیداوار پر قابض ہے۔ زمین اس کی ملکیت، کارخانے اس کی ملکیت یہاں تک کہ انسان بھی جو بظاہر آزاد نظر آتا ہے ذرائع پیداوار سے مالکوں کی گرفت میں پھنسا ہوا سسک رہا ہے یہ گروہ اس بات کو کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کی اس غیر انسانی لوٹ کھسوٹ کی پول کھولی جائے۔

اب اسے خوف کہا جائے یا مصلحت یا یہ سمجھا جائے کہ صاحب مضمون محنت کشوں کے ایسے گروہوں کا تذکرہ کرنا چاہتا ہے جو اس بیسویں صدی میں بھی جس میں ہمارے جیسے ترقی پذیر ملک میں بھی ایٹمی ری ایکٹر قائم کرنے اور جوہری توانائی کو صنعتی مقاصد کے لئے استعمال میں لانے کی باتیں ہوتی ہیں۔ غلاموں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور کر دئے گئے ہیں۔ یہ گروہ ہیں کھیت مزدور۔ خرکار (نہروں وغیرہ کی کھدائی کرنے والے مزدور) اور ترقیاتی منصوبوں میں کام کرنے والے مزدور۔

کھیت مزدور

عام طور پر لوگ کھیت مزدور سے مراد ہاری یا مزارع لیتے ہیں۔ حالانکہ یا مزارع کھیت مزدور کے مقابلے میں کافی خوشحال ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ لوگ زمیندار سے زمین بٹائی پر لیتے ہیں

بٹائی کا طریقہ یہ ہے کہ اگر پارٹی کے پاس اپنے بیل ہیں تو اسے نصف فصل کا حصے دار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے نہ صرف یہ کہ اپنے بیلوں کے ساتھ زمین جوتنی فصل بونی اور کاٹنی پڑتی ہے۔ بلکہ کھیت میں پانی پہنچانا بھی اس کی ذمہ داری ہے ان ذمہ داریوں کے علاوہ بیج بھی اس کے اپنے ہوتے ہیں اور کھاد بھی یعنی محنت کے علاوہ فصل کے لئے جتنی بھی چیزیں ضروری ہیں وہ ہاری کو خود مہیا کرنی پڑتی ہیں تب وہ نصف کا حصہ دار قرار پاتا ہے۔ زمیندار اپنے نصف حصے میں صرف لگان ادا کرتا ہے۔ یہ تو ہے بٹائی کا وہ اصول جو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن بٹائی کے وقت دوسرا اصول برتا جاتا ہے جو روایت ہونے کی وجہ سے لازمی ہوتا ہے۔ جب فصل کی بٹائی شروع ہوتی ہے تو ایک بڑا سا ترازو لگا دیا جاتا ہے اور ایک باٹ رکھ کر تلائی شروع ہوتی ہے خیر و برکت کے لئے پہلا دھڑا پیر کا نکالا جاتا ہے دوسرا مسجد کا اور یہ دھڑے زمیندار کی طرف ڈالے جاتے ہیں اس کے بعد زمیندار کا دھڑا ایک ہاری کا دھڑا ایک پھر زمیندار کا دھڑا ایک اس کے کارندے کا دھڑا ایک دھڑا ہاری کا یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ زمیندار کے گھر کے کتے بلی وغیرہ تک کا حصہ نکالا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس میں زمیندار کے مہمان خانے کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اور اس طرح انصاف پسند زمیندار اور اس کے غریبوں کے ہمدرد کارندے آدھی آدھی بٹائی کے اصول کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہوئے ہاری کو زیادہ سے زیادہ ایک تہائی دے دیتے ہیں (اس تلائی میں ایک من بیالیس سے پچاس سیر تک کا ہوتا ہے۔) ہاری کو اپنا حصہ مل چکا لیکن وہ اسے خود منڈی میں لے جا کر بیچ نہیں سکتا۔ بلکہ یہ کام زمیندار کے کارندے انجام دیں گے کیونکہ فصل بونے کے وقت ہاری نے بیج زمیندار سے حاصل کئے تھے فصل کٹنے تک کھانے کے لئے غلہ لیا تھا پہننے کے لئے کپڑا اور دوسرا ضروری سامان مثلاً صابن، نمک، مرچ اور تیل وغیرہ بنئے سے زمیندار نے اپنے حساب میں دلوایا تھا۔ چونکہ یہ قرض اس وقت لیا گیا تھا جب کہ آنے والی فصل کے پیشگی سودے کے دام بہت کم تھے اس لئے زمیندار نے پیشگی سودے کے بازار کے بھاؤ سے فی من دو تین روپے کم کے حساب سے فصل لکھوائی تھی لہٰذا ہاری کے حصے کی فصل پر زمیندار کا حق ہے تاکہ وہ اسے بازار میں بیچ کر اپنا قرض وصول کرلے۔ زمیندار ظاہر ہے کہ ایماندار ہوتا ہے اس لئے اگر فصل اس کے قرض سے زائد ہو (جو شاید ہی کبھی ہوتا ہے) بقیہ کی قیمت حساب کرکے خود ہی ہاری کو ادا کر دیتا ہے بصورت دیگر آئندہ فصل تک کی تمام ضروریات پوری کرنے کے لئے نیا قرض دیتا ہے۔ اور ہاری اس دائرے کے اندر بڑے عیش و آرام میں زندگی بسر کرتا ہے۔ چونکہ یہ سب دستور میں شامل ہے اور جاگیرداری نظام میں روایت اور دستور، قانون سے زیادہ قابل احترام ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی اعتراض کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ ہاری کھیت مزدور کے مقابلہ میں زیادہ خوشحال ہے یعنی اس کی اپنی ملکیت میں کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ زمیندار اس کی کسی حرکت یا نافرمانبرداری سے ناراض ہو جائے اور یہ چیزیں اس کی بیوی بہن یا بیٹی سمیت ڈاکو لوٹ لے جائیں۔ قانون کی کتابوں میں اس کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ اگر اس نے تین سال تک زمین کے ایک قطعے پر کاشت کی ہے تو اسے بے دخل نہیں کیا جا سکتا لیکن کھیت مزدور ان ساری برائیوں سے پاک ہے اس کے پاس سوائے اپنی قوت محنت کے اور کوئی چیز نہیں یہ کھیت مزدور کس طرح وجود میں آئے؟ یہ تو ایک تحقیق طلب بات ہے اور شاید اس وقت تک رہے جب تک کہ معاشیات کا علم رکھنے والے لوگ سچی باتیں لکھتے ہوئے خوف محسوس نہ کریں اور خدا کا کوئی نیک بندہ انھیں چھاپنے پر تیار ہو جائے۔ بہرحال بے علم لوگوں کی آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ کھیت مزدوروں کی اکثریت یا تو ان چرواہوں پر مشتمل ہے جن کے جانور کسی وبا کا شکار ہو گئے یا بڑھتے ہوئے خاندان کے بڑھتے ہوئے اخراجات نے انھیں ایک ایک کرکے بیچنے پر مجبور کر دیا۔ یا کسی فصلی کارخانے میں کام کرنے والے اپنی بے کاری کے دنوں کا خرچہ پورا کرنے کے لئے انھیں ہنکا لے گئے۔ اور ان جانور ہانکنے والوں کو وقت نے جنگل سے ہنکا کر دیہات تک پہنچا دیا۔ ان کھیت مزدوروں میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی ہے جن کے باپ کے پاس بارانی زمین کا کوئی ٹکڑا تھا اور یہ جب دونوں وقت دو دو روٹیاں کھانے لگے تو روٹی کی محبت بیٹے کی محبت پر غالب آگئی اور باپ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کسی زمیندار یا ہاری کے پاس چھوڑ گیا تاکہ باقی لوگ ایک ٹکڑا دونوں وقت کھا سکیں۔ کہتے ہیں کہ دنیا فریب نظر ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ آنکھیں دیکھ رہی ہیں وہ حقیقت نہ ہو اور حقیقت سے کچھ "پہنچے ہوئے" روشن ضمیر لوگ واقف ہوں لیکن انھیں زبان کھولنے کی اجازت نہ ہو واللہ اعلم بالصواب۔

خیر تو یہ کھیت مزدور کسی زمیندار کے در یا ہاری کی جھونپڑی کے سائے میں وجود میں آئے ہیں انھیں روٹی کی ضرورت ہوتی ہے اور روٹی کے لئے کام کرنا پڑتا ہے اور یہ کام بھی انھیں کسی سے حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام دینے والے کی مرضی ہے کہ ان سے کسی وقت کام لے۔ انھیں سال کے ۳ سو ۶۵ دن اور دن کے چوبیسوں گھنٹے مالک کی خدمت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ سردی، گرمی، بہار اور برسات ہر موسم میں جوتنا بونا اور کاٹنا تو دن میں ہوتا ہے لیکن جانور چرانا، پانی دینا اور فصل کی نگرانی کرنا یہ ایسے کام ہیں جو مزدور کے فرائض منصبی میں داخل ہیں اور سورج غروب ہونے اور طلوع ہونے کے درمیان کسی بھی وقت یا تمام وقت انجام دینے پڑتے ہیں۔

سچ ہے کہ دنیا صرف اس لئے قائم ہے کہ اس میں خدا کے چند نیک بندے بھی ہیں اور یہ مخلوق زمینداروں اور ہاریوں میں بھی پائی جاتی ہے جو کھیت مزدور کو روٹی اور پھٹے کپڑوں کے علاوہ جہاں ان کی تعداد ضرورت سے کم ہے پانچ دس روپے تک ماہانہ تنخواہ بھی دیتی ہے۔

یہ شرائط ملازمت بغیر کسی جبر کے انتہائی آزادانہ طور پر طے کی جاتی ہیں۔ جن کا ذکر کسی قانونی کتاب میں اس لئے نہیں ہے کہ آج تک قانون نہ تو کھیت مزدور تک پہنچا ہے نہ ہی کھیت مزدور قانون تک۔ ان کے بیچ میں بی ڈی ممبر یونین کونسلیں، ڈسٹرکٹ کونسلیں اور اسمبلیاں ہیں اور ان بیچ والوں نے اسی طریقہ کار میں کوئی قانونی نقص نہیں پایا۔ ان کے نزدیک نہ تو اس سے ملک کی معاشی ترقی کی رفتار پر کوئی برا اثر پڑا ہے نہ ہی امن عامہ کو کوئی خطرہ لاحق ہوا ہے

جب میاں بیوی راضی ہوں تو قاضی بے چارے کیا کریں ۔

خرکار

مضمون نگار کی معلومات کے مطابق جس کی کمی کا خود اسے بھی اعتراف ہے مزدوروں کی یہ مخصوص قسم ون یونٹ کی طرح صرف مغربی پاکستان میں پائی جاتی ہے۔ ان کی تعداد کے متعلق کوئی سوال نہ کیجئے کیونکہ اس کا تعلق اعداد و شمار سے ہے۔ اعداد و شمار کا تعلق حساب سے ہے اور ہم اور ہماری حکومت دونوں ہی یوم الحساب پر یقین رکھتے ہیں اس لئے سارا حساب وہیں بے باق ہو جائے گا ابھی تو تیسرے پنجسالہ منصوبے کے ذریعے قومی آمدنی میں ہونے والے اضافے کی باتوں کا وقت ہے ۔

ون یونٹ لسانی اور ثقافتی وحدت ہو یا نہ ہو ہماری خرکار برادری یقیناً ایک لسانی اور ثقافتی وحدت ہے۔ یہ پوری برادری پشتو بولتی ہے۔ ننگے پیر رہتی ہے پھٹی ہوئی شلوار اور پھٹی ہوئی قمیص اس کا قومی لباس ہے لباس کی اس خصوصیت میں تبدیلی ناممکنات میں سے ہے اس برادری کے زیادہ تر افراد برادری میں ایسے شامل ہوئے کہ ٹھیکیداروں کا کوئی آدمی ان کے گاؤں تک پہنچا تھا وہاں حجرے (گاؤں کی چوپال) میں اس نے ذکر کیا کہ وہ لوگوں کو روزگار دلوا سکتا ہے۔ روزگار روٹی کا وسیلہ ہے ۔ اور جسے روٹی نصیب نہیں تھی اس نے اس آدمی کی بات کو غیبی امداد جانا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔ گاؤں گاؤں گھوم کر اس آدمی نے بیس پچیس کا جتھہ تیار کر لیا اور اسے لے کر جنوب کی طرف چل پڑا ۔ یہاں کسی شہر میں ٹھیکیدار سے بات طے کی آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ سو سے دو سو روپے فی کس قیمت وصول کی "مال" ٹھیکیدار کے حوالے کیا اور نئے "مال" کی تلاش میں چل پڑا۔ تیسرے آدمی کا کام ختم براہ راست کاروبار شروع ٹھیکیدار نے شرائط ملازمت بتائیں۔ روٹی لنگر کی ۔ آٹھویں دن گوشت ڈیڑھ روپیہ روز مزدوری۔ انکار کی مجال کسے ٹھیکیدار کے دوسرے آدمی نے انھیں ریل، بس اور پھر پیدل سفر کروا کر جنگل میں اس مقام تک پہنچا دیا جہاں کھدائی کا کام ہو رہا تھا جمعدار نے انھیں دو دو تین تین کی ٹکڑیوں میں تقسیم کیا اور ہر ٹکڑی کو پرانے مزدوروں کی ٹکڑیوں میں شامل کر دیا گیا پہلے دن سورج نکلتے ہی چلے گئے اور کام شروع ہو گیا دوپہر کو روٹی ملی اور کھائی گئی پھر کام شروع سورج غروب ہوا کام ختم روٹی کھائی تو جسم ٹوٹنے لگا ۔

ہم ان ساتھیوں نے سمجھایا کہ دن بھر دھوپ میں کام کرتے رہے ہو تھکن دور کرنے اور کل پھر کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ چرس کا ایک دم لگا لو جس نے لگایا وہ آرام سے سویا جس نے نہیں لگایا وہ ساری رات تڑپتا اور ماں کو یاد کرتا رہا۔ دو تین دن میں دم لگانا اتنا ہی ضروری ہو گیا جتنا کہ کام کرنا پرانے مزدوروں نے بتلایا کہ بھاگنے کی کوشش فضول ہے آبادی تک پہنچنے سے پہلے ہی پکڑے جاؤ گے پھر کوڑے لگیں گے اور جمعدار پیروں میں لوہے کی زنجیر باندھ کر سلایا کرے گا ۔ اگر شہر تک پہنچ بھی گئے تو ٹھیکیدار کے آدمی پکڑ لائیں گے کیونکہ قرض کے کاغذات پر تمہارا انگوٹھا لگ چکا ہے کسی نے سر اٹھانے کی کوشش کی تو جو کچھ سنا تھا اس سے دوچار ہوا اور سر جھکا کر کام میں جٹ گیا۔

کچھ دن گزرے تو پتہ چلا کہ دل بہلانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے جوا مزدوری ملے تو نقد کھیلو نہیں تو پچیس پچاس جمعدار سے ادھار لے لو۔ زندگی ہو یا جوا قسمت کب خرکار کا ساتھ دیتی ہے جیت ہمیشہ جمعدار یا اس کے آدمیوں کی ہوتی ہے۔ یوں ہی دن گزرتے ہیں۔ خرکار کا معمول بھی رہتا ہے۔ ہم پسند لوگ پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرتے ہیں مزہ تو جب ہے کہ خرکار بنیں اور چرس اور جوئے سے بچ کر سال میں ایک جوتا کپڑا بنا لیں یا ٹھیکے دار کے قبضے سے نکل آئیں ۔

ترقیاتی منصوبوں پر کام کرنیوالے مزدور

یوں تو ۱۹۴۷ء ہی سے ترقیاتی منصوبوں کا ذکر سنا جاتا رہا ہے لیکن پچھلے پانچ چھ برس سے ان کا ذکر رات دن کا وظیفہ بن چکا ہے اور انہی کے ذریعے مستقبل سے متعلق حسین خواب دکھائے جا رہے ہیں اب تک جو منصوبے مکمل ہو چکے ہیں سنتے ہیں کہ ان سے قومی معیشت مضبوط ہوئی ہے قومی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے اور معیار زندگی بلند ہوا ہے لیکن ان پر کام کرنے والے مزدور اتنے جاہل اور بے وقوف ہیں کہ ان ساری باتوں سے انکار کرتے ہیں ہم کوئی منصف تو ہیں نہیں کہ کسی بات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ دیں البتہ ایک گواہ کی حیثیت سے ہم حقیقی صورت حال بیان کر دیں گے تاکہ انصاف پسند صحیح فیصلے پر پہنچ سکیں ۔

آپ کو کسی بھی منصوبے پر کام کرنے والوں میں ایسے مزدوروں کی بڑی تعداد ملے گی جنھیں کام کرتے ہوئے پندرہ پندرہ برس گزر چکے ہیں اور ان سے گفتگو کر کے آپ کو علم ہو گا کہ ان کی اجرتیں بڑی مستقل مزاجی سے اسی ایک مقام پر رکی ہوئی ہیں جہاں سے ان کی ابتدا ہوئی تھی مطلب یہ کہ پندرہ برس کام کرنے کے بعد ایک مزدور نے جو مہارت اور تجربہ حاصل کیا ہے اور اس کی وجہ سے کام کی مقدار اور معیار میں جو ترقی ہوئی اس کا کوئی معاوضہ اسے نہیں دیا گیا جس مزدوری پر وہ پندرہ برس پہلے کام کرتا تھا آج بھی اسے وہی اجرت ملتی ہے آپ کو یقین نہ آیا ہو گا لیکن حقیقت حال اس سے زیادہ ناقابل یقین ہے یہ مزدور آج تک مستقل مزدور شمار نہیں کئے گئے۔ اس لئے کہ جن منصوبوں پر وہ کام کرتے ہیں انھیں ایک مقررہ میعاد کے اندر پورا ہو جانا ہے یعنی کام کی نوعیت عارضی ہے ۔ اور مزدوروں سے متعلقہ قوانین میں صرف اس مزدور کو مستقل مزدور کہا گیا ہے جو کسی ایسے کام پر ملازم رکھا گیا ہو جس کی نوعیت مستقل ہو ساتھ ہی ساتھ عارضی ملازمین ان سہولتوں کے مستحق قرار نہیں دئے گئے ہیں جن کے مستحق مستقل مزدور ہیں اس لئے نہ تو ان مزدوروں کے لئے چھٹیوں کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ بونس کا اور نہ کسی ایسی سہولت کا جو ایک چھوٹی سی بھی فیکٹری کے مزدوروں کو حاصل ہو ان کے لئے ملازمت کے تحفظ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انھیں کام حکومت براہ راست مہیا نہیں کرتی بلکہ درجہ بدرجہ کئی سیڑھیاں درمیان میں آجاتی ہیں۔ حکومت کسی بھی منصوبے پر ٹینڈر طلب کرتی ہے ۔ اور کام کا ٹھیکہ ایک یا ایک سے زائد ٹھیکیداروں کو دے دیتی ہے اور انھیں سے اپنا واسطہ رکھتی ہے یہ بڑے ٹھیکیدار کام کو کئی حصوں میں بانٹ کر مختلف چھوٹے ٹھیکیداروں کو دے دیتے ہیں۔ اور یہ ٹھیکیدار بھی اپنے حصے کا کام اپنے سے چھوٹے ٹھیکیداروں کو دے دیتے ہیں اور یہ ٹھیکیدار مزدوروں کو ملازم رکھتے ہیں اس طرح درمیان میں دو تین پارٹیاں آجاتی ہیں اور ہر پارٹی خود زیادہ

سے زیادہ کمانے کی کوشش کرتی ہے اور یہ کمائی صرف ایک طریقہ سے کی جا سکتی ہے اور وہ ہے کم از کم اجرت پر مزدوروں سے کام لینا۔ کئی بار یہ ہوا ہے کہ مزدوروں نے منظم ہو کر اپنی اجرتیں بڑھوانے کی کوشش کی لیکن انھیں آخری جواب یہی ملا کہ اجرتوں میں اضافہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ حکومت انھیں ٹینڈر میں ترمیم کر کے لاگت میں اضافہ کی اجازت دے دے۔

اور ظاہر ہے کہ وہ مزدور جو جنگلوں میں رہ کر چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ کر کام کرتے ہیں یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ حکومت کو اس بات پر مجبور کر دا سکیں۔ پھر مستقل بیکاری کا خوفناک بھوت ہمیشہ جبڑے کھولے ان کا منتظر رہتا ہے اور اس سے نپٹنے کی یہی صورت ہے کہ وہ بد سے بدتر حالات سے سمجھوتہ کریں اور سر جھکا کے کام میں مصروف رہیں۔

یہ صورت حال صرف ایسے منصوبوں تک محدود نہیں جہاں حکومت ساری ذمہ داری ٹھیکیدار پر ڈال دیتی ہے بلکہ حکومت کے قائم کردہ ادارے مثلاً ایگریکلچر۔ ڈیولپمنٹ کارپوریشن واپڈا وغیرہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔

دوسری حیران کن صورت حال یہ ہے کہ ملک کے مزدور قوانین میں ان کے لئے کوئی واضح قانون موجود نہیں، صنعتی اور تجارتی ملازمین کے قانون موجود ہیں فیکٹریز ایکٹ بھی موجود ہے لیکن ان قوانین کا اطلاق زیر بحث صورت حال پر نہیں ہوتا۔

یہ ہے ایک انتہائی سرسری جائزہ ان محنت کشوں کے حالات کار کا جنھیں ہم شاید ہی کبھی یاد کرتے ہیں اور جو خود بھی اپنے وجود کا احساس دلانے میں ناکام رہے ہیں یہ مزدور حالات کے جنجال میں پھنس کر تعمیر و ترقی میں مصروف ہیں۔ یہ جانے بغیر کہ ہر گزرنے والا دن ان کے لئے مزید مشکلات چھوڑتا جا رہا ہے۔ وہ اپنی مظلومیت پر قانع ہیں یہ صورت حال اس وقت تک رہے گی جب تک کہ انھیں اپنی تخلیقی قوتوں کا احساس نہیں ہو جاتا اور وہ اسے استعمال کرنے کا ڈھنگ نہیں سیکھ لیتے عمل کا درس کتابوں سے نہیں زندگی سے ملتا ہے اور زندگی ان مزدوروں کو جو درس دے رہی ہے وہ آخر کار انھیں ایک ایسی جدوجہد پر ابھارے گا جس کے نتیجہ میں ان کے "جینے کے لئے ایک دنیا پڑی ہے اور کھونے کے لئے زنجیروں کے سوا اور کچھ نہیں۔"

قتالۂ عالم

سردار جعفری

اک ادا یہ بھی ہے قتالۂ عالم تیری
آج پہلو میں جو محبوب بنی بیٹھی ہے
دلبری اپنی جتاتا ہو ستمگر جیسے
قامت ناز ہے تلوار کا پیکر جیسے
سائے مژگاں سے لرزتے ہوئے نشتر جیسے

سارے عالم کی شکاری زلفوں کی کمند
کبھی زنداں کبھی مقتل، کبھی میخانہ ہے
بزم یاراں ہے کبھی، کوئے نگاراں ہے کبھی
شمع کی آگ ہے، سوز دل پروانہ ہے
ماتم زخم خزاں، یاد بہاراں ہے کبھی

ہم نے ہر رنگ میں ہر حال میں چاہا ہے تجھے
زندگی جان کے سینے سے لگایا ہے تجھے
تیرے ساغر کو پیا زہر کا ساغر جیسے
بوسۂ لب ہے ترا بوسۂ خنجر جیسے

رباعیات

شیر افضل جعفری

کر کے کتوں کو سوار لئے پھرتے ہیں!
صحرا میں برائے شکار لئے پھرتے ہیں!
دے رکھی ہیں تو نے انھیں کاریں یارب!
جو کاروں کو بے کار لئے پھرتے ہیں!

مالکِ سیم و طلا بنے بیٹھے ہیں!
خالقِ ارض و سما بنے بیٹھے ہیں!
یارب! ترے ہوتے ہوئے یہ اہلِ دول
تیرے بندوں کے خدا بنے بیٹھے ہیں!

یکم مئی سنہ ۱۸۸۶ء
۳ مارچ سنہ ۱۹۶۳ء

رات کی تاریکی، پیشانی پر ماہ منور اور جگمگاتے ستارے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ ضوفشاں ہیں اور تاریخ کے وسیع تر دامن پر مزدوروں کے خون کے قطرے تابندہ و پائندہ ہیں۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مزدوروں نے ہر دور میں ظلم واستبداد کے خلاف آواز بلند کی۔ زندگی کی تیرہ وتار شاہراہوں پر اپنے عزائم کی مشعلیں جلا کر عظمتِ انسانی کو دوبالا کیا۔ اس کے برخلاف خود غرض جاگیرداروں اور ننگے سرمایہ داروں نے ہر دور میں انسانیت کے شفیق وتابندہ چہرے کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے داغ دار و مسخ کیا۔

آج مزدور اپنے ان جیالے ساتھیوں کو خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں جنھوں نے یکم مئی سنہ ۱۸۸۶ء کو شکاگو کی سرزمین پر ظلم وناانصافی کے خلاف لڑتے ہوئے اپنی جان عزیز قربان کر دی تھی۔

جس وقت شکاگو کی سڑکوں پر نہتے اور خستہ حال لاتعداد مزدوروں نے سرمایہ داروں کے وضع کردہ گھناؤنے اور بہیمانہ قوانین کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا تو انسانیت کے خود ساختہ علمبرداروں نے گولیوں کی بارش کروا دی ـــ اور ننھی منی بے جان گولیوں نے نہ جانے کتنے دھڑکتے ہوئے دلوں سے حرارت و توانائی چوس لی اور نہ جانے کتنی حسین امیدوں اور جوان امنگوں کے آشیاں اجاڑ دیئے۔ مگر اس کے باوجود بھی سرمایہ داروں کے گھناؤنے عزائم اور ناپاک ارادے ان کا منہ چڑاتے رہے۔ اور اس تیز و تند طوفان نے جو شکاگو کی سرزمین سے اپنی عظمت وجلال کے ساتھ، ساتھ دنیا کے کونے کونے میں سرمایہ داروں کے ایوان ہائے ستم کو لرزہ براندام کر دیا۔

یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ جو قربانیاں انسانیت کی بقا اور نوع انسانی کی عظمت کو دوبالا کرنے کے لئے دی گئیں وہ کبھی رائیگاں نہیں گئیں، سالہا سال کی انتھک جد وجہد اور پیہم قربانیوں کے بعد "ہتھیارے دھنوان درندوں" نے آخر ش منہ کی کھائی۔ اور مزدوروں کی آواز کو آواز سمجھنے پر مجبور ہوئے۔ آج کا سرمایہ دار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ اس کے بے جان سرمایہ کی روح رواں صرف مزدور ہیں اور بغیر ان کے مردہ سرمائے میں اضافہ ممکن نہیں۔ لیکن اپنی اس بے چارگی کا اظہار وہ کبھی نہیں کرتا بلکہ اس کے برخلاف طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے حتی الامکان غیر محسوس طریقہ سے مزدوروں کی قوت محنت کا استحصال کرتا ہے۔

آج تمام پسماندہ ممالک (بشمول پاکستان) ملک وقوم کے نام پر مزدوروں کا استحصال روا ہے، امریکی و برطانوی سرمایہ دار ہوں یا فرانسیسی وجاپانی سب گدھ کی طرح اپنے ملکی مزدوروں کی بوٹیاں نوچ رہے ہیں اور دوسرے چھوٹے چھوٹے ممالک کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔

اگر ہم علاوہ دوسرے ممالک کے پاکستانی مزدوروں کی پسماندگی اور اس کے اسباب پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہاں کے مزدوروں کی خستہ حالی۔ ملکی وغیر ملکی سرمایہ داروں کی اندھا دھند لوٹ کھسوٹ کا صلہ ہے پاکستان کی طرح تمام پسماندہ ممالک کے سرمایہ دار مغربی سرمایہ داروں کے زیر سایہ پروان چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لئے مزدوروں کے ان حقوق پر آہستہ آہستہ ڈال رہے ہیں۔ جو مزدوروں نے ہٹلر و مسولینی کے چیلوں سے اپنی زندگیوں کی بازی لگا کر حاصل کئے تھے۔ مثلاً ہڑتال کا حق مزدوروں کا واحد ہتھیار تھا۔ جس سے وہ اپنے مفادات کا تحفظ کرتے تھے لیکن ملک وقوم کا واسطہ دے کر ان سے یہ حق بھی واپس لے لیا گیا تاکہ بغیر کسی خوف وخطر کے مزدوروں کا استحصال کیا جائے۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی محب وطن مزدوروں نے ملک وقوم کے نام پر بغیر کسی پس وپیش کے "ہڑتال کا حق" سرمایہ داروں کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس بات کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ محب وطن مزدوروں کے اس عظیم ایثار سے نہ قوم کا معیار زندگی بلند ہوا نہ ملک ہی نے قابل ذکر ترقی کی۔ بلکہ اس کے برعکس چند سرمایہ دار جو ایک دو دو مل یا کارخانوں کے مالک تھے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۳ء تک چھ چھ آٹھ آٹھ ملوں یا کارخانوں کے مالک ہو گئے۔ برخلاف اس کے مزدوروں کی خستہ حالی لازوال ہوتی جا رہی ہے۔ جب مزدوروں نے یہ بات محسوس کر لی کہ سرمایہ داروں نے حسب سابق ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے تو انہوں نے کراچی و دیگر صنعتی شہروں میں یکم مارچ ۱۹۶۳ء کو ہڑتال کا حق، مزدور قوانین میں ترمیم، اجرتوں میں اضافہ و دیگر مطالبات کے حق میں ہڑتال کر کے سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ بے جا مظالم و ناانصافیوں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ مگر بجائے اس کے کہ سرمایہ دار اور حکومت ان مسائل پر غور کر کے انکو حل کرنے کی کوئی صورت نکالتے۔ لیکن اس کے برعکس انھوں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو ۱۸۸۶ء میں امریکی سرمایہ داروں نے کیا تھا اور یکم مارچ ۱۹۶۳ء کو منگھو پیر روڈ پر مزدوروں کے ایک پرامن جلوس پر بے تحاشہ گولیاں چلا کر یہ ثابت کر دیا کہ ہر دور اور ہر ملک کا سرمایہ دار ایک ہی فطرت کا حامل ہے۔

سنسناتی ہوئی گولیاں وطن کے معماروں کا خون چاٹ رہی تھیں اور سرمایہ دار اور اس کے خریدے ہوئے ایجنٹ جھوٹے امن اور اندھے قانون کے تحفظ کا نام لے کر اپنے مردہ ضمیروں کو مطمئن کر رہے تھے۔ اور امن وصلح کا پرچم جو شکاگو کے مزدوروں کے مقدس خون سے سرخ ہوا تھا کراچی کے شہید مزدوروں کے خون سے مزید سرخ کر دیا گیا۔

سرمایہ داروں نے ہمیشہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے تاریخ کے پہئے کو پیچھے کی طرف گھمانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے نتائج ہر دور میں ان کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوئے جس طرح یکم مارچ ۱۹۶۳ء کی تحریک کو چند تخریب پسندوں کی ملک دشمنی اور شر پسندی کا نام دے کر لاٹھیوں اور گولیوں سے دبانے کی کوشش کی گئی بالکل اسی طرح شکاگو کے مزدوروں کے عظیم اتحاد کو "ہے مارکٹ" کے بلوہ کا نام دیکر کچل دیا گیا اور کئی مزدور رہنماؤں پر جھوٹے مقدمات چلائے گئے۔ چار مزدور رہنماؤں کو پھانسی کی سزا دی گئی اس کے باوجود بھی درندہ صفت سرمایہ داروں کی آواز کو

جو دل کی گہرائیوں سے اٹھتی تھی دبانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں مزدوروں نے شکاگو کے شہید مزدوروں کی آواز پر لبیک کہا اور اپنے شہیدوں کے مقدس خون سے سرخ پرچم کو سربلند کئے میدان عمل میں کود پڑے۔ اور پھر فضائیں "دنیا کے مزدور ایک ہو جاؤ" کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگیں۔ سرمایہ داروں کی بنائی ہوئی اندھی عدالتیں و گونگے بہرے قوانین مزدوروں کے بڑھتے ہوئے اتحاد کو ختم کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے یہ بات اور ہے کہ اکثر اوقات مزدوروں کو کچھ عرصے کے لئے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ مگر جیت آخر انہیں کی ہوئی ہے اور آئندہ بھی ہوگی۔

سرمایہ دار سامراجیوں کو اس بات کا تو یقین ہے کہ انکی موت یقینی ہے اسی لئے وہ حیات و کائنات کے معماروں کے خون سے اپنی زندگی کے لمحات میں اضافہ کرنے کی کوششوں میں دن رات مصروف رہتے ہیں۔ مگر ہمیشہ مزدوروں کے ایک ایک قطرہ خون سے بغاوت کے سوتے پھوٹتے رہتے ہیں، اور ان کو روکنا مفاد پرست سرمایہ داروں کے بس کی بات نہیں ـــــ آج پاکستان کا سرمایہ دار بھی عفریت خونخوار کی طرح مزدوروں کا خون چوس رہا ہے۔ لیکن کب تک؟ یہ حکومت کے ناعاقبت اندیش افسران جو سرمایہ داروں کی خوشنودی کے لئے مزدوروں کے جائز حقوق کو پامال کر رہے ہیں۔ کیا تاریخ کے فیصلے کو روک سکیں گے جو سرمایہ داروں کا مقدر ہے ـــ نہیں! شعاع نور کو پامال کرنا ان کے خود ساختہ اختیارات سے باہر ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ مغربی سرمایہ داروں کے پروردہ سرمایہ دار اور ان کے زرخرید غلام مزدوروں کا خون بہا کر اپنی زندگی میں چند لمحوں کا اضافہ کرلیں۔ لیکن موت سے چھٹکارا ممکن نہیں۔ آج نہیں تو کل انھیں اپنے کرتوتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا ـــــ

سلام ان شہیدوں پر جن کا خون انسانیت کی بقا کا ضامن ہے۔
سلام ان شہیدوں پر جن کا خون سرمایہ دارانہ نظام کی موت کا پیغام ہے۔
سلام ان شہیدوں پر جن کا خون مزدور اتحاد کا مظہر ہے۔

زندہ باد شہیدانِ وطن
پائندہ باد عزم بغاوت

شبی فاروقی

"مرے ارادے"

مرے خیالوں کی اپسرائیں
سجیلی، البیلی، پدمنی، کامنی گوپیوں کا روپ دھار کے
گگن سے شیتل پون کی رتھ پر
مدھر چندرما کی تھال لیکر
مری ہی دھڑکن کی تال پر ناچتی ہوئی آرہی ہیں، دیکھو
مری امیدوں کے آشرم میں
عبیر کی دھونیاں رمانے
مرے ارادوں کے سرخ ماتھے پہ چاندنی کا تلک لگانے
مرے ارادے ـ جو دیوتاؤں سے کم نہیں ہیں

سلام سندیلوی

ریشم کا کیڑا

بیکس و غم زدہ ریشم کا یہ ننھا کیڑا
اپنے ہی چاروں طرف جال بنا کرتا ہے

اپنے ہی گرد امیروں کے تعیش کیلئے
اپنے ہی ہاتھ سے دیوار چنا کرتا ہے

اس کی تخلیق ہوئی غم کدۂ عالم میں
مسکراتے ہوئے ارباب دول کی خاطر

وقف یہ شمع رہی صرف شبستاں کیلئے
یہ لہو صرف ہوا رنگ محل کی خاطر

آنکھ کھلتے ہی بلا میں یہ گرفتار ہوا
چھن گئے اسکے مقدر سے خوشی کے لمحات

ظلم کے ہاتھ میں تھرانے لگا جسم نزار
سسکیاں لینے لگی کھولتے پانی میں حیات

دل صد چاک سے جو زلف نکھرتی ہی رہی
زندگی اسکی نگاہوں میں ہے کس درجہ حقیر

بیل بوٹے ہیں کہ یہ خون تمنا کے نشاں
کوئی دیکھے تو ذرا اطلس و کمخواب و حریر

برگ شہتوت پہ بے چارہ گزر کرتا ہے
ہے تو کیڑا ہی مگر نیش زنی سے معذور

کتنا معصوم مگر پھر بھی تشدد کا اسیر
کتنا خاموش مگر پھر بھی فغاں پر مجبور

لاکھ مدھم سہی ننھی سی یہ چنگاری بھی!
چند زرداروں کے رخسار کا غازہ تو نہیں

گنج قاروں بھی نہیں سوز نفس کی قیمت
جوہر زیست زر و سیم کا سودا تو نہیں!

نعیم اروی

ہماری تہذیب کا المیہ؟

جب کبھی کوئی بھلا مانس اپنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ:

تو وہ بڑی سچائی سے اس تلخ حقیقت کا اعتراف کرتا ہے کہ دراصل زندگی اپنے تہہ در تہہ پہلوؤں میں ناآسودگی بیرحمی اور بے چینیوں کا شکار ہے۔ صدیوں کی تہذیبی بھاگ دوڑ، مادی عروج اور معاشرتی رکھ رکھاؤ نے اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ تو دیا مگر تحفظ تیقن، ترحم جو انسانی زندگی کی صدیوں کی فکری اور عملی پکار ہے۔ اس سے انسان کو دور رکھا — شاکیہ منی نے کہا "زمین سے اناج پیدا کرو، اور روٹیاں بانٹ کر کھاؤ، سادہ زندگی بسر کرو" مگر صدیوں کی یہ روحانی گونج ہر زمانے کے شاکیہ منی کی یہ آواز، صدا بصحرا ثابت ہوتی کتنی کوششش بھی ایک ایسے نظام حکومت اور ایک ایسے بہتر سماج کے لئے جدوجہد کرتا ہوا آیا جس میں انسان، انسان کی طرح زندہ رہے، امیر غریب چھوٹا بڑا، افضل کمتر کے امتیازات کے بت ٹوٹ جائیں۔ مگر اسکی تمام ترسعی وعمل جدوجہد انسان کی خونخوار جبلی سرگرمیوں کے سامنے ڈھے گئیں، اس کے سیدھے سچے خواب کی بے حد نازک لڑیاں لوٹ ٹوٹ کر بکھر گئیں، آج اس تمدنی اور مادی عروج کے بعد بھی انسانی آبادی کا بیشتر حصہ معاشی، اخلاقی بدحالی کا شکار افلاس وعسرت کی بے حیا زندگی بسر کرنے پر مجبور رہے۔ یہ ہماری داستان کا سب سے المناک باب ہے جہاں پہنچنے کے بعد ہماری فکر اور جذباتی اڑان کے بال و پر اپنی ہی خصلتوں کی تیز دھوپ سے جھڑنے لگتے ہیں اور ہم یکایک دھڑام سے پستی اور ذلت کے گہرے سمندر میں گر کر غوطہ کھانے لگتے ہیں۔

ہم ساتھ چلے تھے سورج کے سو اس کا یہ خمیازہ ہے
سورج تو نکل کر ڈوب گیا اب اپنی شام غبار ہوئی

"سرمایہ" اور زر کے غلاموں کی سائنس نے جو زندگی میں ایک بے حد اہم کردار انجام دینے کا دعویٰ کرتی ہے۔ انسانی زندگی کی رہنمائی کرنے کی بجائے انسان کو ایک ایسے راستے پر دھکیل دیا ہے جو دم بدم تباہی اور خاتمے کی طرف لے جاتا ہے۔ انسانیت کے پھیلے ہوئے ہاتھ اور پھٹی ہوئی جھولی میں ڈالنے کے لئے اس کے پاس سوائے ہائیڈروجن بم اور میزائل کے کچھ بھی نہیں، ذہنی سرگرمیوں کی اس جھلسا دینے والی بھٹی میں ایک ننھی خوبصورت بچی جو اسکول جاتے ہوئے ٹھہر کر اپنے پیر کے جوتے کا تسمہ باندھتی ہوئی مسکراتی ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، زمین پر اگے ہوئے پھل دار درخت، گھروں اور باغیچوں پر جھکی ہوئی پھولوں کی نرم و نازک بیلیں، سرسبز و شاداب میدان، پہاڑوں پر پھوٹ کر بہتے ہوئے پانی کے چشمے، چاند کی ہلکی ملائم روشنی، سورج کی زندگی آمیز حرارت کروڑوں میل پر پھیلی ہوئی زمین کی کوکھ جو حسن اور عظمت کی علامت ہے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، اور اگر انکی اہمیت ہے تو بس اتنی کہ آسمان کے اسرار کا اندازہ لگایا جائے (مینار بابل کی تعمیر) چاند پر راکٹ کے ذریعہ پہنچ کر انسانی ذہن کو اس فکر سے نجات دلائی جائے کہ چاند پر کوئی مخلوق آباد ہے یا وہ ایک ویران کرہ ہے۔ سورج کی شعاعوں میں جوہری توانائیوں کی ملاوٹ سے نسل انسانی کو کم سے کم مدت میں مفلوج بنا دیا جائے۔ زمین سے اسکی قوت پیدائش، حسن اور عظمت چھین کر ویران کر دی جائے اور اسکول جاتی ہوئی بچی کو کسی ایسی ترکیب سے ختم کر دیا جائے کہ وہ لمحہ بھر میں نقش بہ دیوار بن کے رہ جائے — انکی آج کی تمام تر ذہنی فکری اور جبلی سرگرمیوں کے ارتقار عروج اور بلندی کی پہلی داستان ہے۔

آدم بشر تھے ایک سیدھے سادھے آدمی تھے، کھیتی باڑی سے اناج پیدا کرتے تھے، کپڑا بنتے تھے، اور ایک عام انسان کی طرح زندگی گزارتے تھے۔ اپنی طویل عمر میں انھوں نے انسانی تہذیب کے بنیادی خدوخال اجاگر کئے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو سادگی، نیکی، کاشتکاری اور خورد و نوش کے قاعدے کلیے سمجھانے تک ہی اپنی تعلیمات کو مرکوز رکھا۔ یہ تہذیب انسانی کی پہلی پہچان تھی جس پر نسل انسانی کو سیاسی سماجی اور ثقافتی زندگی کی ایک بڑی پیاری سی عمارت تعمیر کرنی پڑی تھی، مگر اس سے پہلے کہ تہذیب انسانی تتلا تتلا کر بولتی اور پاؤں پاؤں چلنا سیکھ لیتی انسانی جبلت کے وحشی پن نے نیکی اور سادگی پر پہلا بھرپور وار کیا۔ ہابیل ابن آدم کا قتل، قابیل ابن آدم کے ہاتھوں اسوقت ہوا جبکہ کوئی آدمی قتل کرنے کے فعل سے واقف نہیں تھا۔ تاریخ انسانی میں یہ پہلا قتل تھا جسمیں شر کی قوتیں انسانی روپ میں نمایاں ہوئیں اور گناہ کی بھٹی میں جبر و تشدد اور عدم تحفظ کی تیز آگ بھڑک اٹھی گناہ کی یہ تیز بھٹی ہر صدی اور ہر زمانے میں روشن رہی اور ہر میدان اور ہر زمانے میں شر پسند انسان کی منفی قوتیں اس جہنمی بھٹی کے لئے ایندھن مہیا کرتی رہیں۔ یہاں نوح کا واقعہ بیان کر دینا خالی از علت نہیں کیونکہ تاریخ انسانی کا پہلا عظیم حادثہ جو طوفان اور سیلاب کی صورت میں انسانوں پر نازل ہوا۔ محض انسان کی جبروتی قوتوں پر روک بٹھانے کے لئے تھا۔ خبردار کرنے کے لئے تھا۔ جب کبھی دنیا میں شر پھیلے گا کائنات میں توازن اور ہم آہنگی برقرار رکھنے کے لئے NATURAL FORCES صف آرا ہونگی اگر کائنات کے نظام میں کچھ ایسی ترتیب اور روک نہ ہو تو ہمیشہ بڑی طاقتیں چھوٹی طاقتوں کو ہڑپ کر جائیں اور قبل از تاریخ "جسکی لاٹھی اسکی بھینس" کا دور انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور تعمیری سرگرمیوں کا ایک دم سے بیڑا کر دے۔ آدم کی سادہ اور پر اثر تعلیمات کا جادو انسان کی وحشی فطرت کے سامنے ٹوٹ چکا تھا۔ آدم کی تعلیمات کی نیکیاں اسکی اولاد پر اترتیں اور زمین سے اناج اگتے۔ درختوں سے پھل اور پھول نکلتے، سورج کی کرنیں انسان کے جسم میں توانائی پہنچاتیں اور چاند کی ملائم روشنی میں حسین لڑکیاں دھیمی دھیمی سرگوشیاں کرتی ہوئی مسکراتیں اور مردوں کے چہرے بے فکری، آسودگی اور اطمینان میں ڈوبے ہوتے اور ہر طرف امن اور شانتی کی روشنی پھیلی ہوتی۔ اس کے برعکس اسکی اولاد اس کی تعلیمات کے اثر سے نکل کر جہل، تعصب، تشدد اور گمراہی کی ظلمت میں ڈوبی اور

اپنی منفی قوتوں کے بے دھڑک اظہار میں اپنی نجات کا راستہ تلاش کر رہی ہے۔ انسان کا ذہن جب اپنے زندہ ضمیروں سے رشتہ منقطع کر لیتا ہے تو اسکی ساری اچھائیاں ختم ہو جاتی ہیں انسانی خصوصیات کا سارا حسن مٹ جاتا ہے اور شر کی بے پناہ قوتیں انسانی روپ میں منتقل ہو کر زمین کی ساری خوبصورتی نوچ ڈالتی ہیں۔ ایسے تاریک دور میں انسانی تہذیب کی بڑھتی ہوئی سرگرمیاں رک جاتی ہیں۔ ادب اور ثقافت کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں تخلیق کی آگ بجھ جاتی ہے، اور کائنات پر، انسانوں پر مکمل تباہی کے عذاب ٹوٹ پڑتے ہیں

تاریخ انسانی میں ایسے حادثات و واقعات بکھرے پڑے ہیں کہ باوجود رہنمائی اور رہبری کے انسانی ذہن نے بغاوتیں کیں، اور انکی سرکوبی کے لئے شیطانی قوتیں زمین پر ظاہر ہوتی رہیں، یہ قصہ ہر صدی اور ہر زمانے کا ہے۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ زمین پر گناہ کے بیج بوئے گئے اور سروں کی کھیتیاں کٹیں۔ زندگی کے سارے دکھ ساری مصیبتیں ہماری پیدا کردہ ہیں اور ہم اپنے ہی پیدا کردہ دکھوں کے سمندر میں غرق ہوتے رہے۔

گوتم نے کہا "زمین تقسیم کرو۔ کیونکہ زمین کی تقسیم کے بعد اناج تقسیم ہونگے روٹیاں تقسیم ہونگی، محبت تقسیم ہوگی طاقتور ہاتھوں میں اناج کا بڑا حصہ آئے گا۔ کمزور ہاتھ اپنے حق کی روٹیاں بھی حاصل کرنے سے رہ جائیں گے۔"

اور ایسا ہی ہوا کہ ہم نے اپنی زمین تقسیم کر لی۔ کھیتیاں بانٹ لیں اناج کے حصے کر لئے۔ چند مضبوط اور طاقتور ہاتھ ساری زمین پر قبضہ جما بیٹھے۔ زندگی کا سارا حسن ساری دلکشی عیار ونکی زنبیل میں پہنچ کر غائب ہو گئی۔ ملکی معیشت، قدرتی وسائل "چند" مضبوط ہاتھوں کی میراث ہو گئی۔ ایک طرف تو چند لوگ دولت کے "مینار بابل" تعمیر کرتے رہے۔ اور دوسری طرف آبادی کا بڑا حصہ چاہ بابل میں الٹا لٹکا زندگی کے عذاب سے چھٹکارا حاصل کرنے کی دعائیں مانگتا رہا۔

میرے مضمون کا یہ موڑ دراصل ان حادثوں کا پیش خیما بنتا رہا ہے جسکا تذکرہ میں اوپر کر چکا ہوں۔ یہ چند مضبوط ہاتھ ہی درحقیقت قابیل کی علامت ہیں جو ہر صدی اور ہر زمانے میں انسانی خون سے ہاتھ رنگتے ہیں زمین پر شر پھیلاتے ہیں اور فتنہ وفساد کے سبب بنتے ہیں۔ قابیل مرا نہیں، قابیل زندہ ہے اور وہ ہر صدی ہر زمانے میں شر کی علامت بن کر زندہ رہے گا۔ وہ دنیا کی آبادی کے ایک بڑے حصّہ سے خراج کے طور پر اناج، روٹیاں وصول کرتا رہے گا۔ اور اس کے بدلے اپنی فیکٹریوں سے تیار کردہ لوہے اور فولاد کی بھاری بھاری مشینیں جو بڑی تیزی سے آدمیوں کو تباہ و ناکارہ کر رہی ہیں تقسیم کرتا رہے گا۔ نوآبادیاتی نظام کا دلدادہ قابیل غریب اور پسماندہ ملکوں میں تجارتی منڈیاں قائم کرے گا۔ اپنے ملک کی مصنوعات مہنگے داموں پر فروخت کرتے ہوئے دوسرے ملکوں کی دولت سے اپنی فیکٹریوں میں آتشی اسلحہ، ہائیڈروجن بم اور میزائل تیار کرتا رہے گا۔ تاکہ ایک بار اور آخری بار اس زمین پر فتنہ فساد پھیلا کر انسانوں پر ایک ناقابل بیان تباہی و بربادی مسلط کر دے اور پھر وہی ہوگا۔ جو ہمیشہ ہوتا آیا ہے کہ شیطانی بلائیں ہمیں گھیر لیں گی۔ ہم پناہ مانگیں گے اور ہمیں پناہ نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ ہمارے سینے میں گوشت اور خون کا دھڑکتا ہوا دل لوہے کی سنگت میں سخت اور بے حس ہو چکا ہوگا۔ اسمیں محسوس کرنے کی وہ قوت نہیں رہی جو اس ننھی بچی کی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ سکے۔ جب وہ اسکول جاتی ہوئی لمحہ بھر ٹھہر کر اپنے جوتے کا تسمہ باندھتی ہوئی مسکراتی ہے۔

مگر میرے مضمون کا یہ خاتمہ تو بالکل غلط ہے۔ ایسا تو نہیں ہے۔ نہ ہی ایسا ہونا چاہیئے۔ اور نہیں تو خود میرے اپنے سینے میں میرا اپنا دل دھڑک رہا ہے جو گوشت کا ہے جس میں خون ہے۔ جو لوہے کی سنگت میں رہتے رہتے اسے موم کی طرح پگھلا دینے کا جادو جانتا ہے۔ جو محسوس کرنے کی قوت رکھتا ہے جو ننھی بچی کی معصوم مسکراہٹ کے تمام معنی سمجھتا ہے ـــــ کاش ـــــ اے کاش ـــــ سب کے دل بھی میرے دل کی طرح ہو جائیں ـــــ!!

مسلم شمیم

بجھے بجھے سے ہیں شاعر کے ذہن و دل کے دیئے
بھٹک رہا ہے کہاں جائے روشنی کیلئے
قدم قدم پہ ہیں روشن شرارِ خوف و ہراس
جھلس رہے ہیں در و بام جذبہ و احساس
نظر اداس ہے ویراں ہیں سارے نظارے
جبینِ صبح سے پھوٹے لہو کے فوارے
زمیں پہ لاشوں کے گلشن فضائیں خوں کی نمی
اب اہتمام بہار چمن میں کیا ہے کمی
جمال صبح وطن آنسوؤں میں ہے مدغم
عروس عہد بہاراں کی آنکھ ہے پُرنم
بہ فیض جبر و ستم غم نے فتح پائی ہے
وفا کے نام پہ دل نے شکست کھائی ہے
شعار دیدہ وری سے گلوں کی، شاد نہیں
چمن کے پھول چمن ہیں یہ ان کو یاد نہیں
ستم کو اہل ہوس بھی ستم سمجھتے ہیں
یہ اور بات ہے شعلوں کو پھول کہتے ہیں
فریب و جہل کے ہر سو ہیں رینگتے سائے
کہ چند سانپ خزانوں پہ پھن ہیں پھیلائے
حصار ظلم بظاہر بہت ہے مستحکم۔!
اس اژدہے کا کئی بار کھل چکا ہے بھرم
یہ خوف جبر کے پیکر ہیں کاغذی چیتے
کوئی قریب سے دیکھے یہ دانت ہیں جھوٹے
سمٹتی رات کے سائے سحر کی راہ میں ہیں
ہم اور چند گھڑی ظلم کی پناہ میں ہیں
ہے کفر مسلک الفت میں ذکر سود و زیاں
رکھو خلوص کی مشعل ہمیشہ ضو افشاں۔!!
زمانہ ساتھ تمہارے ہے گنگناتے چلو
رہ وفا میں محبت کے گیت گاتے چلو

ہربنس لال ساہنی



سکھو گذشتہ پانچ روز سے تیز بخار میں نڈھال لکڑی اور اپلوں والی کوٹھڑی کے کونے میں پڑی ایک چھوٹی سی کھٹیا پر پڑا کراہ رہا تھا۔ پہلے دو دن تو اس نے کوئی دوا نہیں پی تھی۔ پی اس لئے نہ تھی کہ دو دن کے بخار میں تو بابوجی نے دوائی ہی نہ لاکر دی تھی۔ تیسرے دن بھی ایک شیشی میں لال رنگ کی مکسچر ہسپتال سے بابوجی کی بوڑھی ماں لے کر آئی تھی۔ ایک رات پہلے بابوجی اپنی ماں سے کہہ رہے تھے کہ سکھو کو دوائی ہسپتال سے لا دو۔ یہ تو پڑ ہی گیا۔ دکھائی دیتا ہے۔ اور اس طرح دو چار روز اور پڑا رہا تو گھر کا کام کون کرے گا۔؟

سکھو نے یہ سب سنا تھا۔ تین روز سے اسنے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ پہلے دو روز وہ بخار میں بھی رات کے دس بجے تک جھوٹے برتن مانجھتا رہا تھا دن بھر اس نے ببلی کو گود میں اٹھائے رکھا تھا۔ لیکن اب پورے تین دنوں سے وہ چھٹی پر تھا۔ وہ چھٹی پر نہیں رہنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جلدی سے بخار سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنا کام سنبھال لے۔ وہ اپنے کام سے کبھی جی نہ چراتا تھا۔ گو گھر کے اس کام سے اسے سخت نفرت تھی۔ برتن مانجھنا، کمروں میں جھاڑو لگانا۔ بچوں کو دن بھر گود میں اٹھائے اٹھائے پھرنا۔ گائے کے لئے پٹھے کاٹنا، سانی کرنا اور گوبر اٹھانا۔ ان سب طرح کے کام سے اس کا دل اوب جاتا تھا۔ لیکن وہ کیا کرتا؟ اس سارے کام کے عوض ہی میں اسے گھر میں بچی ہوئی صبح کی روٹی شام کو اور شام کی بچی ہوئی صبح کو پیٹ بھرنے کے لئے دی جاتی تھی۔ اور ہر مہینے کی دس تاریخ کو بارہ روپے نقد ملتے تھے۔ جن میں سے دس روپے وہ بسولی اپنی ماں کو منی آرڈر کر دیتا تھا ــــ باقی کے دو روپوں سے وہ اکثر اپنے مالک کے بچوں کی حرص، انکی طرح انڈے کھانے، چائے کے ساتھ پیسٹری اور کیک کھانے اور کبھی کبھی کا چوچلا کر کیا کرتا تھا۔ یہ سب کچھ وہ چھپ چھپ کر بازار میں جاکر کھا آتا تھا

اب وہ بیمار تھا تو اس نے کئی بار اوپر سر تک اوڑھے ہوئے ایک پرانے سے ٹاٹ نما کمبل میں آنکھیں جھپکا جھپکا کر تصور میں ہی اپنے آپ کے لئے ایک ڈاکٹر کو دیکھنے کے لئے آتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے تپتے ہوئے بدن پر اپنے ننھے ننھے ہاتھ پھیرتے ہوئے کئی بار خواہش کی تھی کہ اسکو دیکھنے کے لئے شہر کے ہسپتال والا ڈاکٹر اپنی کار میں بیٹھ کر آئے اس کے ہاتھ میں ربر کی نوٹیاں ہوں اور وہ اس کے پیٹ اور چھاتی پر لگا لگا کر اس کا معائنہ کرے۔ اس کے بازو پر سوئی لگائے اور پھر اس کے لئے اپنے رنگین چھپے ہوئے پیڈ پر دوائی لکھ دے ــ وہ دوائی بازار سے بابوجی بھاگ کر اسی وقت لے آئیں۔ اسے دوائی پلاتے ہوئے اس کے گال پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہیں "یہ دوائی پی لو میرے بیٹے۔! دوائی پیتے ہی بخار یوں بھاگ جائے گا جیسے گدھے کے سر سینگ ــ"

سکھو کی یہ خواہش پہلی بار جب اس کے دل میں ابھری تھی، جب ببلی کو سخت بخار آگیا تھا۔ ایسے ہی کار میں بیٹھ کر ڈاکٹر آیا تھا نوٹیاں لگائی تھیں سوئی اس کے بازو میں چبھوئی گئی تھی اور بابوجی بھاگ کر بازار دوائی لینے گئے تھے ــ دوائی دیتے ہوئے ببلی سے ایسے ہی پیار کرتے اور اسی قسم کے جملے کہتے ہوئے اس نے سنے تھے۔ جبھی اسکی خواہش نے جنم لیا تھا۔ کاش میں بھی بیمار ہو جاؤں۔ اور بابوجی میرے لئے ایسے ہی فکر میں ڈوب جائیں ــــ بیمار تو وہ ہو گیا تھا۔ نصف خواہش پوری ہو گئی تھی۔ لیکن باقی سب باتیں اس کے لئے نہ تھیں ــ وہ ببلی نہ تھا۔ وہ ایک معمولی گھریلو نوکر تھا۔ جس کے لئے دوائی بھی لائی اس لئے ضروری تھی تاکہ وہ جلد ہی کام کے قابل ہو جائے ــ گندے برتنوں کے لگے ڈھیر کو صاف کر سکے۔ کمرے میں کوڑے کے لگے ہوئے ڈھیر اٹھا سکے۔ دن بھر روتے ہوئے ببلی کے آنسو پونچھ سکے اور اپنی گود میں اسے اٹھائے اٹھائے پھر سکے۔ لیکن وہ ہسپتال کی لال رنگ کی مکسچر پی کر اس قابل نہ ہو سکا ــــ چھٹے روز اس نے منہ پر سے کمبل، ہٹایا۔ تو اس نے سامنے بی بی جی کو کھڑے پایا۔ ان کا منہ غصہ سے لال سرخ ہو رہا تھا۔ ہر روز کی طرح گلابی مائل پوڈر اور سرخی لپسٹک سے کیا ہوا لال نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں شعلے بھی نکلتے ہوئے اس نے محسوس کئے تھے۔ وہ شعلے اس کے بدن میں سمائی ہوئی تپش سے بھی زیادہ جھلس دینے والے تھے۔ ڈر کر اس نے منہ پر کمبل سرکا لیا۔ اور وہ اسی طرح کانپنے لگا جیسے روز بخار ہونے سے پہلے وہ دیر تک سردی لگنے سے کانپتا رہا تھا۔ ایک جھٹکے سے بی بی جی نے کمبل اس کے منہ سے ہٹایا۔ اور آگ برساتی ہوئی انکی زبان سے نکلا۔

"حرام کھانے! کیا ایسے ہی چارپائی توڑے گا یا کام کرے گا؟" اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رندھی ہوئی آواز میں اس نے جواب دیا۔ "بی بی جی مجھے سوئی لگوا دو ــ میں کل ہی ٹھیک ہو جاؤں گا ــ ٹھیک ہوتے ہی اپنا کام کرنے لگوں گا۔"

بی بی جی نے جواب میں گھور کر اسے دیکھا اور وہ کوٹھری سے باہر چلی گئیں۔

ــــ شام کو ہسپتال کا کمپونڈر سنت رام آکر اسے سوئی لگا گیا۔ اس کا بخار جیسے سوئی کی نوک کے ہی لئے ترس رہا تھا۔ سوئی چبھتے ہی بخار جانے کہاں بھاگ گیا۔ صبح اٹھتے ہی بخار نہ تھا۔ لیکن اس کے جان کو لگی دائمی بیماری کی طرح گندے برتنوں کا ڈھیر ــ ببلی کے پیشاب اور ٹٹی سے لتھڑے ہوئے فراک نیکر اور بوشرٹ کا ڈھیر جوں کا توں تھا۔ انھیں دیکھتے ہی سکھو کو جیسے دوبارہ سردی لگنی شروع ہو گئی تھی۔ وہی پہلے روز والے بخار والی شدید سردی۔

وہ انتہائی کمزور ہو گیا تھا۔ اس کا منہ پہلے سے بھی زیادہ سرد ہو گیا تھا اور اسکی آنکھوں کے نیچے سیاہی مائل ہلکے ہلکے داغ پڑ گئے تھے۔ اس نے بی بی جی کی نظر بچا کر کئی بار ڈرائنگ روم میں رکھے ڈریسنگ ٹیبل پر لگے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا تھا۔ ایک انڈہ۔ ایک پاؤ دودھ میں پینے سے یہ کمزوری پانچ روز میں دور ہو جائے گی بڑی آسانی سے۔ اس نے یہ سوچا۔ کیونکہ بیماری کے بعد ببلی کو یہی خوراک دی جاتی تھی ــ یہ سوچنا جتنا آسان تھا۔ اسکو عمل میں لانا

اس کے لئے اس سے زیادہ مشکل تھا۔ وہ سکھو تھا ببلی نہیں ـــ ببلی نہیں تو نہ سہی وہ سکھو ہی سہی مگر دس تاریخ کو ملنے والے بارہ روپے تو سکھو کے ہیں ببلی کے تو نہیں ـــ یہ سوچ کر اسکی میل سے اٹی ہوئی گردن ایک پل کے لئے پوری سختی سے تن گئی ـــ دس تاریخ آئی تو بی بی جی نے اس کے ہاتھ پر سات روپے رکھے اور حساب بتاتے ہوئے دوائی پر خرچ ہوئے اور بیماری کے دنوں میں کام نہ کرنے کی وجہ سے تنخواہ میں سے کٹوتی کی تفصیل گنوا دی۔ سکھو نے ایک ایک روپے والے سات نوٹوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس زور سے مروڑ کر جیب میں ڈال لیا جیسے اس نے بی بی جی کی گردن مروڑ کر اپنی جیب میں رکھ لی تھی اس کے اوپر کے دانت نیچے کے دانتوں کو بری طرح پیس رہے تھے اس نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر صحن میں آ گیا ـــ

باہر صحن میں بہاری انڈوں والا ٹوکری فرش پر رکھے بابو جی کے لئے دو درجن انڈے چھانٹ چھانٹ کر نکال رہا تھا۔ سکھو نے انڈوں کو دیکھا تو اسکی ہڈیاں چیخ اٹھیں اس نے اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کیا۔ اسے اپنا سر چکراتا ہوا لگا۔ اس نے جیب میں سے مڑے تڑے ہوئے نوٹ نکالے اور ان میں سے تین روپے بہاری کو دیتے ہوئے بولا "ایک درجن انڈے میرے لئے بھی چھانٹ دو ـــ دیکھنا موٹے موٹے ہوں"

بہاری نے حیران کن نگاہوں سے سکھو کو گھورا ـــ سکھو نے اسکی حیران کن نظروں کو بھانپا اور وہ بڑے رعب سے بولا "کیوں تو نوکروں کو انڈے نہیں بیچتا ـ؟"

بی بی جی یہ سن کر باہر آ گئیں، اور آتے ہی غصہ سے بپھر اٹھیں "اے نوکروں کو، انڈے بیچتے کیا درد پڑتی ہے ـ مگر نوکر درجن درجن بھر انڈے کھانے لگے تو ضرور درد پڑ جائے گی" یہ سن کر سکھو پاگلوں کی طرح بی بی جی کو دیکھنے لگا ـــ اس نے محسوس کیا جیسے بی بی جی کے منہ سے بچھو گر رہے تھے۔

"دیکھتا کیا ہے مرجانے؟ تو اگر انڈے کھائے گا تو ہمارے بچے کیا کھیں گے اپنی اوقات کو بھول رہا ہے ـــ اپنی کھال میں رہ ـ یہاں کام کرنا ہے یا دھکے کھانے ہیں تقدیر کے ـ؟"

سکھو نے آج پہلی بار بی بی جی کے غصہ کی پرواہ کئے بغیر اور تنک کر کہا۔

"اپنے پیسے ہیں ـ میری تنخواہ ہے جو چاہوں گا کھاؤں گا ـ آپ کے پلے سے نہیں کھا رہا ہوں" ـــ کہنے کو تو وہ کہہ گیا ـ لیکن وہ وہاں کھڑا نہ رہ سکا ـــ وہ بھاگ کر اپنی لکڑیوں والی کوٹھڑی میں آ گیا ـ اور آتے ہی اپنے کھٹولے پر آ گرا ـ گرتے ہی جانے کیوں وہ پھپھک پھپھک کر رونے لگا ـ وہ دیر تک ہچکیاں بھر کر روتا رہا ـ اس نے آنکھیں اپنی کہنی سے پونچھیں اور وہ چپ چاپ کوٹھڑی کی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے مکڑی کے جالوں کو گھورنے لگا ـ جالے میں ایک لاغر سا کیڑا پھنسا ہوا تھا ـ اس نے غور سے اس کیڑے کو دیکھا ـــ وہ کیڑا ٹانگیں ہلاتا اور شاید ہاتھ بھی چلاتا تھا ـ ہاتھ یوں اس نے محسوس کئے کیونکہ کیڑے کی دو ٹانگوں کے علاوہ بھی دو ان سے قدرے چھوٹی چھوٹی ٹانگیں تھیں جو اسکی دانست میں ٹانگیں نہ تھیں بلکہ اس کے ہاتھ تھے کیونکہ ٹانگیں تو دو ہوتی ہیں ـ لیکن دو ٹانگیں تو انسان کی ہوتی ہیں ـــ جانوروں کے لئے ـ کیڑوں کے لئے ایسی قید نہیں ہوتیں ـــ پھر جالے میں کیڑے ہی تو پھنستے ہیں ـ انسان تو جالے میں نہیں پھنستے ـ پھر میں کیوں اس گھر کے جالے میں پھنسا ہوا ہوں ـــ میں بھی کیوں نہیں اس جالے کو توڑ کر نکل بھاگتا ـ وہ یہ اس وقت سوچتا رہا جب تک کہ سنسناتی ہوئی تھری ناٹ تھری کی بلٹ کی طرح ـ بی بی جی کی آواز اس کے کانوں کو چیرتی ہوئی نکل گئی ـــ دوسری صبح وہ اپنے مالک کے کرایہ دار ملہوترا صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا ـ وہ چوروں کی طرح وہاں آیا تھا تاکہ اسکی بی بی جی کو پتہ نہ چلے ملہوترا صاحب شہر میں ایک بڑی فیکٹری میں انجینئر تھے ـ وہ اخبار دیکھ رہے تھے ـ سکھو کو سامنے کھڑے دیکھا تو چشمے میں سے آنکھ جھپکاتے ہوئے بولے "کیا بات ہے سکھو؟"

"مجھے فیکٹری میں نوکر کرا دو ـ میں اب گھر کی نوکری نہیں کرنا چاہتا۔"

"فیکٹری میں تو کیا کرے گا رے ـ؟ ابھی تو تیری عمر بہت چھوٹی ہے ـ تو وہاں کیا کرے گا ـ"

"میں پرزوں کو ڈبوں میں بند کروں گا ـ کاغذ لپیٹنے کا کام سیکھ لوں گا ـ لیبل لگا لونگا ـــ مزدوروں کو پانی پلانے کے کام پر لگوا دو ـــ میں نے سنا ہے فیکٹری میں ایسے چھوٹے چھوٹے کام بہت ہوں گے ساب ـ! میں اب برتن نہیں مانجھنا چاہتا ـ میں ٹٹی، پیشاب والے کپڑے نہیں دھونا چاہتا ـ میں کوئی اجّت کا کام کرنا چاہتا ہوں ساب ـ! اجّت کا کام ـــ"

اتنی لمبی تقریر کرنے کے بعد سکھو سسکنے لگا ـــ ملہوترا صاحب دیر تک اسکی جانب بغور دیکھتے رہے ـ دلاسے سے اسے اپنے پاس بلایا اور اسکی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے "جا اب تو کام کر میں فیکٹری میں تیرے لئے کوشش کر دوں گا"

سکھو کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی اسکے پتلے پتلے پشاوری لال لونگی مرچوں جیسے ہونٹ مسکان سے سکڑ گئے اور وہ ملہوترا صاحب کو اپنے ہاتھ کے انگوٹھے کے ساتھ والی انگلی سے اشارہ کرتا ہوا کہنے لگا ـ

"جرور جرور میری نوکری کی خبر کرنا ساب ـ میں آپ کا احسان تا جندگی نہیں بھولونگا"

یہ بات اس نے بڑی سنجیدگی سے پختہ عمر کے لوگوں کے سے انداز میں کہی تھی ـ

سکھو دو سال پہلے جب اپنے گاؤں بسولی سے ادھر پنجاب میں آیا تو اس نے اپنی مرضی سے کوئی کام ڈھونڈنے کی بڑی کوشش کی ـ اس نے ایک لوہار کے ہاں ہتھوڑا کوٹنے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسکی چھوٹی عمر اور ننھے ہاتھ دیکھ کر لوہار مذاق کرنے لگا ـ اس نے ایک درزی سے شاگرد بنا لینے کی درخواست کی تو اس نے جواب میں کہا کیونکہ وہ جموں کے علاقے کا ہے اس لئے کسی گھر میں رسوئی کے کام پر لگ جائے ـ ہر آدمی سے اس نے یہی سنا کہ اس کے علاقے کے رہنے والے چھوٹی عمر کے بچے جب یہاں نوکری کیلئے آتے ہیں تو رسوئی کی نوکری ہی کرتے ہیں ـــ لیکن اسے رسوئی کی نوکری سے گھن آتی تھی اس نے اپنے گورے گورے بے داغ ہاتھوں کو دیکھا ـ وہ ان ہاتھوں سے جھوٹ لگی پلیٹوں سالن سے سنی ہوئی رکابیوں اور چائے کی پتی سے ٹھسی ہوئی کیتلیاں نہیں دھونا چاہتا تھا اسکی اس ننھی منھی خواہش کو ہی بابو انبالش چند نے اسے اپنے ہاں رکھ لیا تھا اور کہا تھا کہ ابھی وہ گھر میں ہی رہے جگہ نکلنے پر وہ اسے اپنے بھٹے پر کام پر لگا لیں گے ـــ ان دو سالوں میں بھٹے میں ابھی تک جگہ نہ نکلی تھی ـ اور وہ بی بی جی کے جور و ستم کا شکار بنے رہنے پر مجبور تھا ـ اس درمیان اس نے کچھ اپنی طاقت سے زیادہ ہی ہاتھ پیر مارے تھے تاکہ وہ اس لق و دق صحرا کو پار کر سکے ـ وہ وقت بچا کر ایک بار گورنمنٹ کے دستکاری اسکول میں داخلے کے لئے بھی ہو آیا تھا ـ وہاں سے بھی اسے یہ کہہ کر بھگا دیا گیا تھا کہ وہ آٹھ جماعت پاس نہیں ہے ـــ وہ آٹھ جماعت پاس کیوں نہیں تھا ـ اس پر بھی اس نے غور کیا تھا ـ لیکن اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا ـ وہ اتنا جانتا تھا کہ آٹھ جماعت پاس تو اس کا باپو بھی نہیں تھا ـ اس کا چھوٹا بھائی بھی نہیں تھا ـ اسکے سارے خاندان میں کوئی بھی نہیں ہے ـــ وہ ایک بار صبح ہی صبح فیکٹری کا بھونپو بجتے ہی گیٹ پر بھرتی کیلئے آئے ہوئے ہجوم میں شامل ہوا تھا ـ مگر گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے اسکی چھوٹی عمر دیکھ کر اسے وہاں سے بھی بھگا دیا تھا ـ اس کا قد بھی چھوٹا تھا ـ قد بڑا ہوتا تو وہ عمر زیادہ بتا کر کچھ ہیرا پھیری کر لیتا ـــ جہاں جاتا وہاں لوگ اسے اپنے گھر میں نوکر رکھنے کی بات کرتے جس کام سے وہ حد درجہ تنگ آ چکا تھا ـ اب رہ سہ کر ملہوترا صاحب ہی اسکی امید کا آخری سہارا تھے ـ ان سے وہ اکثر اشاروں اشاروں میں اپنے کام کے بارے میں پوچھ چکا تھا لیکن شاید ابھی فیکٹری میں کی گئی انکی کوشش کارگر نہ ہوئی تھی ـــ ایک روز ملہوترا صاحب اسے فیکٹری سے آتے ہوئے راستے میں ملے جب وہ ببلی کو پرام میں بٹھائے گھما رہا تھا ـ ملہوترا صاحب نے بتایا کہ اس کا کام قریب قریب ہو گیا ہے لیکن فی الحال اسے دو ایک ماہ کے لئے مرہٹہ انجینئر صاحب کے گھر پر ہی کام کرنا ہوگا ـ کیونکہ اسکی میم

دلیس گئی ہوئی ہے ۔ اس کے واپس آنے پر وہ صاحب اسے فیکٹری میں لگوا دے گا ــــ سکھو نے شروع کے الفاظ سنے تو جیسے خالی پھکنے میں ہوا بھر دی گئی ہو وہ خوشی سے پھول گیا ۔ لیکن جب اس نے سنا ابھی دو ماہ کی قید باقی ہے تو جیسے غبارے میں سے ہوا نکال دی گئی تھی ۔ وہ پھر مرجھا گیا ۔ ملہوترا صاحب نے اسکے پھول سے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں سے اس کے جذبات کا اندازہ کر لیا ۔ اور وہ بھی مغموم سے آگے بڑھ گئے ۔ ان کے بس میں کچھ نہ تھا ۔ وہ سکھو کے دل کی اڑانوں کے ساتھ کئی بار اڑے تھے اور اسے ہر بار پرواز کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے ۔ لیکن وہ بھی مجبور تھے ــــ ماحول اور حالات نے انکو بھی بال و پر کر دیا تھا ــــ دوسری صبح جبکہ بابو جی ابھی بھٹے پر نہ گئے تھے ۔ کہ سکھو نے ڈرتے ڈرتے اپنا حساب صاف کرنے کے لئے کہا ۔ بابو جی کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ۔ بی بی جی کی زبان پر جیسے تپتی ہوئی لوہے کی سلائی رکھ دی ہو ۔ انھوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا ۔ اور وہ اپنی کہکر سکھو کو نوکری چھوڑنے سے باز رکھنے کی سعی ، کرنے لگے ۔ " تو ایک دم بلا وجہ کیسے نوکری چھوڑ سکتا ہے " یہ بابو جی کہہ رہے تھے ــ " تم نے خالص گھی کے پراٹھے اور مکھن سے اٹی ہوئی لسیاں پی پی کر یہ صلہ دیا ہے ۔ تم جاؤ گے تو یہاں کام تمہاری ماں کرے گی ۔ تم گھر سے باہر قدم تو رکھو تمہاری ٹانگیں توڑ کر رکھ دونگی ۔ اچھا کھلاؤ ۔ اچھا پلاؤ ساتھ میں منٹھی روپوں کی بھی دو اور جواب میں تم نے یہ دن دکھایا ؟ تم نہیں جا سکتے " یہ شکووں سے بھرپور بھاشن بی بی جی نے اسے پلا دیا ۔ دن ، بھر وہ بابو جی اور بی بی جی کی دھمکیاں سنتا رہا اور سوچتا رہا ۔ یہ لوگ مجھے کیوں نہیں جانے دیتے کیا اس کو بارہ روپے میں خرید لیا ہے ۔ کیا وہ چلا جائے تو کوئی اور سکھو ان کو نہیں مل سکتا ــ اگر وہ بخار سے مر جاتا تو یہ کیا کرتے ــ اور اگر یہ سب کام بی بی جی خود کر لیں تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے ــــ اسکی ماں بھی تو گھر کا سب کام خود ہی کرتی ہے ۔ گھر گھر میں یہ فرق کیوں ہے بی بی جی اور میری ماں میں کونسی بات علیحدہ ہے ــــ بی بی جی میری ماں سے زیادہ صحت مند ہیں ۔ زیادہ اچھی خوراک کھاتی ہیں ۔ پھر کام سے جی کیوں چراتی ہیں ۔ ان تمام باتوں پر اس نے ایک فلسفی کی طرح غور کیا تھا ۔ لیکن وہ کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تھا ۔ البتہ ایک بات اس نے ٹھان لی تھی وہ یہ کہ وہ صبح سویرے ہی اس گھر کو چھوڑ کر اس فیکٹری کے انجینئر کے گھر چلا جائے گا جس نے اسے فیکٹری میں لگوانے کا وعدہ کیا تھا ــــ

نئے مالک کے رویے نے بہت حد تک سکھو کو تسکین دی ۔ صبح اس کا ناشتہ بنانا ، دوپہر کو روٹی ۔ شام کو چائے اور پھر رات کو روٹی تیار کرنا ہی اس کا کام تھا ۔ دو چار چینی کے برتن دھونے پڑتے تھے ، کوئی کپڑا نہ دھونا پڑتا تھا ۔ کوئی بالک نہ کھلانا ، پڑتا تھا ۔ اور کھانے کے لئے بھی وہی کچھ ملتا تھا جو وہ دلیش پانڈے صاحب کیلئے تیار کرتا تھا ۔ اس نے اس نئے ماحول میں اپنے آپ کو یوں محسوس کیا جیسے سزا کی مدت کم رہ جانے پر قیدی رعایتیں دی جاتی ہیں ۔ قیدی وہ اب بھی تھا کیونکہ وہ گھر کا نوکر بن کر رہنے کے لئے بالکل راضی نہ تھا ۔ وہ اسی طرح دن گننے لگا ۔ جیسے رہائی پانے والا قیدی ایک ایک پل گنتا ہے اسکی رہائی میں ابھی پورے دو ماہ باقی تھے ــــ وہ دو ماہ اس نے گزار دیئے ۔ اور وہ نئے ماحول نئی فضا اور نئے لوگوں کے ملنے کی امیدمیں زمین پر پیر نہیں رکھ رہا تھا ۔ وہ ایک انجانے نشے میں سرشار تھا ــ وہ نشہ چشم زدن میں ہرن ہو گیا ۔ جب پانڈے صاحب کی بیوی نے اسکو آتے ہی گھر میں کام کرتے رہنے کا حکم دیا ــ سکھو نے اسے بتایا کہ اسکی نوکری صرف اس کے یہاں آجانے تک تھی ۔ لیکن اس مرہٹن میم نے اسکی ایک نہ سنی ۔ اس نے صاحب سے فریاد کی وہ ملہوترا صاحب کے پاس جا کر بھی رویا لیکن سوائے جھوٹے طفل تسلیوں کے اس کے پلے کچھ نہ پڑا ــ مرہٹہ صاحب ہر روز اسکو بہکانے کے لئے ایک نیا وعدہ کرتا اور سکھو کو اس پر یقین آجاتا ۔ وہ اپنے یقین کو میم صاحب کے سامنے دوہراتا ۔ تو وہ طنز سے ہنس دیتی اور پھر بڑی صاف گوئی سے اسے بتاتی " صاحب کے بھروسے مت رہنا بیٹھو ۔ تم کو یہاں ہی کام کرنا ہوتا ــــ صاحب ہمارا کہنا جیادہ مانا کرتا یا تمہارا ــ ؟ ہم کہتا تم یہاں کام کرنا ہوتا ۔ فیکٹری میں نہیں " سکھو یہ سب سنتا اور دلیل دیتے ہوئے کہتا " میم صاحب میں نے یہ گھر کا کام اب نہیں کرنا ہے ۔ میں پہلی نوکری اسی شرط پر چھوڑ کر آیا ہوں ۔ صاب نے مجھے بھروسہ دلایا ہے کہ فیکٹری میں کام دلوا دونگا "

" کیسے کام دلوا نا سکتا ؟ صاحب کا بچہ ۔ صاحب کچھ نہیں کرنا سکتا ۔ تم کو یہیں کام کرنا ہوتا "

میم صاحب کی گوری گوری پیشانی پر غصہ سے کئی گانٹھیں سی پڑ گئیں اور انھیں دیکھ کر سکھو سہم گیا ۔ وہ دل ہی دل میں یہاں سے بھی بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا ــ بھاگنے کے اپنے اس ارادے کو ایک دن میم صاحب کے سامنے بھی اس نے ظاہر کر دیا " میم ساب اگر مجھے فیکٹری میں نوکری نہ ملی تو میں چپکے سے یہاں سے بھاگ جاؤنگا ۔ پھر تم کیا کریگا "

میم صاحب نے ایک لمحے کے لئے فکرمند ہوتے ہوئے اس پر غور کیا اور پھر وہ اپنی ننگی پنڈلیوں کو ناخنوں سے کھجاتے ہوئے بولی ۔

" تم کہیں نہیں بھاگ سکتا ۔ ہمارا بھائی بمبئی میں پولس انسپکٹر ہے ۔ تم دھرتی کے نیچے سے بھی نکالنا مانگتا ــــ سمجھے " پولس انسپکٹر کا ذکر سن کر سکھو ڈر سے کانپنے لگا ۔ یہ وہم اس کے دل میں ڈاکخانے کے پارسلوں پر لگی لاکھ کی مہر کی طرح چپک گیا اس کے چھوٹے سے دل میں پچھلے تین سالوں سے اٹھتا ہوا جوار بھاٹا شانت ہو گیا اس کے سینے میں جوش اور ولولوں سے سلگتا ہوا الاؤ بجھ گیا ۔ اسکی امیدیں تڑپ تڑپ کر دم توڑتی ہوئی محسوس ہوئیں ۔ اسکی آنکھوں کے سامنے سالم مرغے کی چھوڑی ہوئی ہڈیاں ڈونے میں پڑی تھیں ، جنکو چبا چبا کر ابھی صاحب نے جھوٹی پلیٹوں میں ڈال دیا تھا سرسوں کے تیل کی جلن سے کالا ہوا فرائی پین اس کا منہ چڑا رہا تھا ــ درجنوں دال سالن اور سلاد کی جھوٹی پلیٹیں اسے آنکھ دبا دبا کر فحش اشارے کرتی ہوئی محسوس ہوئیں ۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ایک ہی بار سب کو اٹھا کر باہر سڑک پر دے مارے ۔ لیکن میم صاحب کا بھائی پولس انسپکٹر کا خیال اس کے معصوم دل پر کنکھجورے کے پنجوں کی طرح آکر چپٹ گیا ۔ اور اس کا شریر کانپ اٹھا ۔ اس کے خیال میں اب میم صاحب سے چھٹکارا پانا مشکل تھا ــ

ایک دن پھر وہ ملہوترا صاحب کے ہاں گیا ۔ اور اپنی زندگی کی دکھ بھری داستان رو رو کر بیان کرنے لگا ۔ ملہوترا صاحب نے دلیش پانڈے صاحب سے پھر ملنے کا وعدہ کیا ۔ اور ساتھ ہی اسے ڈھارس بندھائی کہ اگر دلیش پانڈے کچھ نہیں کرے گا تو وہ خود کچھ نہ کچھ اس کے لئے ضرور کریں گے ۔ یہ سنکر سکھو کی امیدیں پھر سانس لینے لگیں ــ اسکی رگوں میں منجمد ہوا خون پہلے کی طرح ہی کچھ گرم ہونے لگا ۔ اور وہ ملہوترا صاحب سے بڑی سنجیدگی سے گھریلو نوکروں کی قلت ۔ ان کے ساتھ مالکان کا برابرتاؤ اور گھریلو نوکروں کی سے کہ سے غیر ضروری ضرورت کے متعلق طرح طرح کے ان گنت سوال کرنے لگا ــــ ملہوترا صاحب نے جواب میں اسے بتایا تھا کہ گھریلو نوکروں کی ضرورت جہاں آسودہ اور کھاتے پیتے لوگوں میں آرام کرنے کی عادت اور صفائی کرنے اور اپنی گندگی خود صاف کرنے سے جی چرانے کا نتیجہ ہے ۔ بلکہ اسکی جڑیں دنیا میں حکومت کرنے کے جذبہ اور برتری کے احساس کو ، خوراک مہیا کرنے کے لئے امیر لوگوں کے ذہن میں پاتال تک پھیلی ہوئی ہیں ۔ جب تک ہمارے سماج میں نابرابری غریبی امیری اور چھوٹے بڑے کا احساس موجود ہے ہزاروں ٹھکرام سکھو بن کر گھر گھر کی جھوٹ کھاتے ہوئے گندگی صاف کرنے پر مجبور رہوں گے " سکھو کو انھوں نے اسکی سمجھ سے بہت پرے کی باتیں بتا دی تھیں ۔ پھر بھی اس نے دل ہی دل میں کچھ اس طرح ضرور سمجھ لیا تھا کہ اسکی مصیبت کی وجہ موجود ہے اور صرف وہی اکیلا اسے نہیں بھگت رہا ۔ اور اس جیسے ہزاروں اس کے ساتھی ہیں اور جبتک وہ وجہ دور نہیں ہوتی وہ اس مکڑی کے جالے سے نہیں نکل سکتا وہ یہ دیواریں نہیں پھلانگ سکتا ۔

ملہوترا صاحب کے گھر سے واپس آتے ہی اس نے اپنے گھر میں قدم رکھا تو میم

صاحب نے غراتی ہوئی بلی کی طرح اسے دبوچ لیا۔

"کہاں گیا تھا اتنا دیر سے "

" ملہوترا صاحب کے ہاں " اس نے سیدھا سا جواب دیا۔

"کیوں گیا ادھر کو؟" میم صاحب نے پولس والوں کا سا لہجہ بنا کر کہا۔

" وہ مجھکو فیکٹری میں نوکر کرائیں گے " اس نے جواب میں کہا۔

" ملہوترا صاحب . . . . صاحب . . . . صاحب . . . تم تو بے وقوف ہوتا۔ ارے وہ صاحب نہیں ہے اور اگر صاحب ہونا ہوتا تو ہمارے صاحب سے چھوٹا ہوتا ہوتا۔ وہ نوکر کیسے کرا سکتا؟ تم یہاں گھر میں کام کرتا ہوتا فیکٹری میں نہیں ـــــ"

میم صاحب کی اس دلیل نے سکھو کو پھر الجھا دیا۔ اور اپنی اچھی زندگی کو حاصل کرنے کی۔ لڑائی اور روز روز کی باتوں سے وہ پھر اوبنے لگا۔ اس نے پھر وہی عام اور سہل سی بات سوچی کہ بھگوان نے اسے اسی کام کے لئے پیدا کیا ہے ـــ

اب سکھو پچھلے ایک ماہ سے یہاں میم صاحب، دیش پانڈے صاحب ـــ ملہوترا صاحب کے شہر سے سو میل دور ریلوے کے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے گھر میں کام کر رہا تھا۔ وہاں سے ایک رات وہ چپکے سے چھپ کر گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ آیا تھا۔ اسٹیشن ماسٹر صاحب ملہوترا صاحب کے کوئی قریبی رشتہ دار تھے۔ اور انکو ایک ایسے گھریلو نوکر کی ضرورت تھی جو صاف ستھرا ہو۔ محنتی ہو۔ باادب ہو ـــ کھانا پکانا جانتا ہو۔ وہ اسکو اپنے بچوں کی طرح رکھنا چاہتے تھے۔ کیونکہ انکی عمر اب ریٹائرمنٹ کے قریب تھی۔ بچے جوان ہوکر اپنا اپنا گھر بسا چکے تھے۔ اور وہ دونوں میاں بیوی آرام کی زندگی گزارنے کے لئے گھر کے چھوٹے موٹے کام کا بوجھ کسی سے نوکر پر ڈال کر اسکو اپنی بزرگانہ شفقت اور محبت دے کر اپنے گھر ہی کا ایک فرد بنا لینے کے خواہشمند تھے یہ سب جان کر ملہوترا صاحب نے سکھو کے متعلق سوچا اور اسے موجودہ زندگی سے چھٹکارا دلا کر یہاں اپنے سے سو میل دور ان اسٹیشن ماسٹر صاحب کے ہاں بھیج دیا۔ وہ محض گھر کا نوکر بن کر آنے کے لئے یہاں بھی تیار نہ تھا بلکہ وہی پرانا وعدہ اپنی گرہ میں باندھ کر ساتھ لایا تھا۔ کہ اسٹیشن ماسٹر صاحب اسے ریلوے کے محکمہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام ضرور دلوا دیں گے ـــ

ایک مہینے سے وہ یہاں کام کر رہا تھا۔ جسمانی طور پر اسے قدرے آرام ملا تھا کام کم اور خوراک صاف ستھری تھی۔ اچھی مقداریں مل رہی تھی۔ ساتھ ہی اسٹیشن ماسٹر صاحب اور انکی بیوی کے پیار بھرے برتاؤ سے اسے یقین ہوگیا تھا کہ دنیا میں سبھی لوگ ایک سے نہیں ہوتے۔ دنیا میں اچھے برے سب ہی طرح کے لوگ موجود ہیں ـــ لیکن یہ خیال رہ رہ کر اس کے ذہن پر دستک دیتا رہتا تھا کہ وہ گھریلو نوکر بن کر نہیں رہے گا۔ اسکو ریلوے میں کوئی چھوٹا موٹا کام حاصل کرنے کے لئے اسٹیشن ماسٹر صاحب سے کہنا چاہیئے۔ اسکے خیال میں یہ صاحب ضرور اسکی مدد کریں گے اور اسے کسی نہ کسی کام پر لگوا دیں گے ـــ اس نے جب پہلی بار صاحب کے سامنے اس مسئلے کو رکھا۔ تو صاحب کچھ سوچ میں پڑ گئے جیسے سکھو کے لئے ان کا انتخاب غلط نکلا ہو وہ امید کرتے تھے کہ سکھو ان کے غیر معمولی ہمدردانہ رویئے سے متاثر ہوگا۔ اور ان کو کبھی چھوڑ کر جانے کی بات نہیں کرے گا ـــ جواب میں انھوں نے راست بازاور بھلے لوگوں کی طرح ہی اسے حوصلہ دیا اور اسکی خواہش کے مطابق اسکو ریلوے میں نوکری دلانے کا وعدہ کیا۔ لیکن ساتھ ہی اپنے گھر میں ایک چھوٹی عمر کے نوکر کی ضرورت پر زور دیا ـــ سکھو نے انکی اس جائز ضرورت اور انکی ہمدردی پر بہت دیر تک سوچا لیکن اسے کوئی حل دکھائی نہ دیا۔

ایک سال وہاں گزر جانے کے بعد اب وہ اپنے آپکو ایک پالتو پرندے کی طرح محسوس کرنے لگا۔ جو اپنے ممالک کی کی محبت سے اتنا مغلوب ہو چکا تھا اور اسکی قیمت کے بوجھ میں اپنے پنجرے کو چھوڑنے کے لئے کوئی راہ نہ پاتا ہو ـــ

سکھو کی حالت اس پرندے سے صرف اتنی مختلف ضرور تھی کہ اس کے ذہن میں اپنے ہم جنس پرندوں کی طرح اور نیلی آسمان کی چھاتی پر قلابازیاں لگانے کی خواہش ابھی تک زندہ تھی وہ اس غلامی سے نجات چاہتا تھا۔ لیکن اب پہلے سے زیادہ مضبوط بیڑیاں اپنے پاؤں میں پڑی ہوئی جان پڑیں ـــ شاید اس لئے کہ وہ مار گرایا ہوا ایک شکار تھا اور اب ایک پالتو چڑیا ـــ شکاری کی پکڑ۔ پالنے والے اور ہمدرد دل کی گرفت اسے زیادہ سخت محسوس ہوئی اور وہ اسٹیشن ماسٹر صاحب کو اپنا وعدہ یاد دلانے کی ہمت بھی کھو بیٹھا۔ وہ ان کو کچھ کہنے سے پہلے سوچنے لگتا کہ ان کا کام کون کرے گا۔؟ میرے بغیر یہ کیا کریں گے یہ مجھے نوکری دلائیں اور میں انھیں دکھ دے کر بھاگ جاؤں ـــ اپنی اس دماغی الجھن سے وہ سٹپٹا گیا ـــ اس کے ذہن میں بار بار آتا کہ یہ نام نہاد محبت اور جھوٹی ہمدردی، بی بی جی اور مرشٹن میم صاحب کے جور و ستم سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہاں اپنی، مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کی جدوجہد تو تھی۔ یہاں تو اس کے بال و پر بھی کتر لئے گئے تھے ـــ کام تو یہاں بھی اسے اسی طرح کرنا پڑتا ہے۔ وہی جھوٹے برتن وہی جھاڑو وہی کوڑا۔ وہی وقت بے وقت کی آوازیں ـــ للکاریں ـــ

ایک رات صاحب کی ٹانگیں دباتے ہوئے سکھو نے بڑی حلیمی اور التجا کے لہجے میں صاحب کو اپنی خواہش اور ان کے وعدے کو یاد دلایا تو صاحب نے کروٹ لیتے ہوئے کہا "سکھو تمہارے لئے اسٹیشن پر پانی والے کولر پر نوکری تو ہے۔ ساٹھ روپے ماہوار ملیں گے۔ لیکن وہ جبھی ممکن ہے اگر تم اپنی جگہ اپنے چھوٹے بھائی کو گاؤں سے منگوا کر یہاں چھوڑ دو ـــ جس دن وہ آجائے تم اپنی نوکری پر جا سکتے ہو ـــ" سکھو کی جیسے لاٹری نکل آئی تھی وہ چارپائی سے اچھل کر نیچے کھڑا ہو گیا۔ اور پھر فرط مسرت سے اسٹیشن ماسٹر صاحب کے تئیں تشکر میں صاحب کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اور دیر تک خوشی کے آنسوؤں سے ان کے چرنوں کو دھوتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد صاحب نے اسے اٹھایا اور پیٹھ پر دلار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے " جا اب جا کر سو جا۔ تھوڑا آرام کر لے " وہ ملتجیانہ نگاہوں سے صاحب کو دیکھتا ہوا برآمدے میں پڑی ہوئی اپنی چارپائی کی جانب بڑھ گیا۔ چارپائی پر لیٹا تو برآمدے کی چھت کی ان کڑیوں کو دیکھنے لگا جو رسوئی کے پاس ہونے کی وجہ سے کالی ہو گئی تھیں۔ اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرا اور اپنے ہاتھوں کی جانب دیکھنے لگا۔ جو کڑیوں کی طرح ہی اتنے دنوں کی رسوئی کی نوکری میں کالے ہو گئے تھے ـــ وہ سوچنے لگا۔ اب اسٹیشن کی نوکری ملنے پر یہ ساری سیاہی وہ کولر کے پانی سے دھو ڈالے گا۔ ساٹھ روپے مہینہ ملیں گے۔ وہ اپنی ماں کو بسولی سے یہاں بلوائے گا۔ اپنے پاس رکھے گا۔ اب اسے بھی لوگوں کے جھوٹے برتن صاف کرنے پڑیں گے۔ وہ اب بڑھاپے کا آرام پائے گی ـــ کانشی اس کا چھوٹا بھائی اب بارہ سال کی عمر میں اسکول میں داخل ہوگا۔ میں اسے پڑھاؤں گا ـــ میں اسے پڑھاؤں گا ـــ

یہ سوچتے سوچتے وہ رک گیا ـــ کانشی کو تو یہاں میری جگہ نوکری کرنا پڑیگی ـــ جب مجھے نوکری مل سکے گی ـــ صاحب کی ضرورت پوری ہوگی جبھی میں جا سکوں گا ـــ انھوں نے میرے لئے اتنا کچھ کیا۔ اور میں ان کے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتا ـــ اتنا صرف اتنا ـــ اپنی رہائی کے لئے اپنے بھائی کو غلام بنانا ہوگا ـــ جن جھوٹے برتنوں اور غلاظت سے میں نجات چاہتا ہوں اس کو اس میں سر دینا ہوگا ـــ خود غرضی کی حد ہے ـــ ذلت کی انتہا ہے ـــ اس کا ذہن ٹھٹھر گیا ـــ اس کا بدن سردی سے کانپنے لگا۔ اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی ـــ اس نے شرم سے کمبل اپنے اوپر لے کر اپنا منہ چھپا لیا ـــ ●



الطاف مشہدی

وقت آئے گا قید خانوں پر
رحم کھائیں گے آستانوں پر

سر برہنہ بہار پھرتی ہے
کیا زمانہ تھا گلستانوں پر

وقت مجبور ہو کے دیتا ہے
چند الزام پاسبانوں پر

سج رہا ہے بزعم زر کاری
خون کا رنگ کا رخانوں پر

اف وہ بجلی کہ موسم گل میں
آنکھ رکھتی ہے آشیانوں پر

حشر تک کارگر نہیں ہوگی
کوئی تعزیر بادہ خانوں پر

جام ہوتا ہے ہاتھ میں الطاف
پاؤں رکھتا ہوں آسمانوں پر

پورن کمار ہوش

بقا کیلئے

یہ زندگی کے بھکاری جو مر گئے آخر
مرے خیال میں حقدار زندگی ہی نہ تھے

کشید ہو کے رگوں سے انہیں کا گرم لہو
ملوں سے اٹھتا رہا سر مئی دھواں ہو کر
انہیں تو جہد مسلسل سے بھی اماں نہ ملی
زمیں ابھر نہ سکی پھر بھی آسماں ہو کر

انہوں نے اپنے پسینے کے قطرے قطرے سے
چمن کو کھیت کو زرخیزی و نمی بخشی
یہی وہ اہل وطن تھے جنہوں نے مر مر کے
ازل سے اہل سیاست کو زندگی بخشی

مگر یہ لوگ یہی محنتی جفاکش لوگ
زمیں کے جسم میں جن کا جوان خون بہے!
سڑک پہ پٹریوں پہ ایڑیاں رگڑتے ہوئے
مریں تو اس کو بھلا کون بزدلی نہ کہے

بجا یہی کہ بہر حال ان کو مرنا تھا
غلط مگر کہ یوں توہین زندگی کرتے
اناج سے بھرے گودام کے ہی سائے میں
غلط کہ بھوک کے کمزور ہاتھ سے مرتے

انہیں یہ حق ہی کہاں سانس لیں زمانے میں
جو جانتے نہیں کیا ہے حیات کی قیمت
نظام و ضبط سے بڑھ کر ہے آدمی کی بقا
ہر ایک شے سے سوا ہے حیات کی قیمت

کلیم الٰہی

نقّالۂ شرافت

شاداب ٹیکسٹائل ملز کا گراؤنڈ رنگ برنگے شامیانوں اور رنگین جھنڈیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اس سجاوٹ میں توفیق صدر شاداب لیبر یونین کا بڑا حصہ تھا۔ کہیں کہیں اردو میں لکھے بینر بھی نظر آرہے تھے۔ جنکی تحریریں مختلف تھیں "مزدور اتحاد زندہ باد" "شاداب سیٹھ زندہ باد" اور "یوم مئی زندہ باد" وغیرہ وغیرہ۔ شاداب ٹیکسٹائل ملز کے مالک سیٹھ شاداب بھائی بمبئی والا بڑے حلیم اور خدا ترس انسان مانے جاتے تھے یوں تو وہ ہر مزدور کو اپنا بھائی سمجھتے۔۔۔۔ مگر اصل۔۔۔۔ خدا جانے۔۔۔۔۔۔۔

آج ملز کے گراؤنڈ میں ایک جلسہ یوم مئی کے سلسلہ میں سیٹھ صاحب کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ سیٹھ صاحب نے نہ صرف آدھے وقت کی چھٹی کر دی بلکہ مزدوروں کی خاطر صدارت بھی قبول کر لی تھی۔ انھوں نے کہا تھا "میرے پاس وقت تو نہیں۔ مگر خیر مزدوروں کی خاطر یہ قربانی دونگا" اور سارے مزدور سیٹھ کی اس قربانی پر پھولے نہ سمائے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو اس قربانی کو پسند نہ کرتے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں چپ تھے۔

آج گراؤنڈ میں چاروں طرف مزدوروں کا ہجوم بے پایاں نظر آرہا تھا۔ کچھ مزدور لیڈر دوسرے ملوں سے بھی بلائے گئے تھے۔ یہ سب اسٹیج کے آگے بچھے فرش پر، بیٹھے تھے۔ فرش کے دونوں سروں پر کرسیوں کی قطاریں تھیں۔ جن پر ملز کے کلرک بیٹھے گھٹیا سگرٹوں سے دھواں اڑا اڑا کر مزدوروں کو مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بڑی حقارت سے ان کے میلے کچیلے اور پھٹے لباسوں کو دیکھتے اور اپنی زین کی پرانی پتلونوں کو بغور دیکھ کر اس انداز سے سگرٹ کا گل جھاڑتے جیسے اس مل کے وہ واحد ہی تو مالک ہیں۔۔۔۔ باقی سب کرسیاں آنے والے مہمانوں کے لئے مخصوص تھیں، سیٹھ کے آنے میں دیر تھی۔ مسٹر توفیق انتظامات کے سلسلے میں ادھر ادھر، بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کے پیچھے چند مزدور تھے جو ان کے حکم پر کام کرنے لگتے۔

کسی نے توفیق سے پوچھا "سیٹھ صاحب کب تک آئیں گے۔؟" توفیق نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "بس آدھا کلاک اور ہے"

وقت گذارنے کے لئے لوگ باتیں کر رہے تھے۔ یہ باتیں زیادہ تر سیٹھ ہی سے متعلق تھیں۔ کسی نے کہا "سیٹھ ہو تو ایسا۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔ ایسا آرام تو سرکاری کلرکی میں بھی نہیں"۔

"ہاں بھئی" دوسرا بولا۔ ٹھیک کہتے ہو۔ سیٹھ ہم لوگوں کا بڑا خیال رکھتا ہے ذرا کسی کو تکلیف ہوئی اور وہ چڑھا منیجر پر۔ ابھی پچھلے ماہ ہی کی تو بات ہے جب لالہ جمن کا ہاتھ مشین سے کٹا۔ دیکھا تھا کتنی جلدی خود سیٹھ آیا۔ لالہ کو ہسپتال بھیجا شام لالہ کے گھر جا کر اس کے باپ کو نقد دو سو روپے دیئے۔۔۔ بھیا کون پوچھتا ہے ہاتھ کٹنے پر مزدور کو، مگر اپنا سیٹھ زندہ باد" پہلے نے بات کاٹی "اپنا صدر توفیق بھی بڑا رحم دل ہے، سیٹھ سے لڑ کر سو روپے اور دلا یا لالہ کو۔۔ تین سو روپیہ۔۔۔

ارے باپ رے باپ" دوسرا ہنسا "مگر یہ لوگ کیا بولتا ہے کہ ہاتھ کٹنے پر حکومت زیادہ رقم دلاتا ہے۔ مقدمہ کر دو" پہلا جلدی سے بولا "ارے انکی کیا ہے۔ یہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنا توفیق سیٹھ سے مل گیا ہے۔۔۔ چمچہ ہے سیٹھ کا۔ بیچ میں اس نے بھی حصہ وصول کیا۔ اور جمن کو الٹی سیدھی پڑھا کر چپ کر دیا۔ یہ لوگ تو کسی کو بھلائی کرتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اپنا توفیق تو لیڈر ہے لیڈر۔۔۔۔۔"

سیٹھ کی بجھوری شیورلیٹ ملز کے گیٹ پر لگ چکی تھی، اور گیٹ پر کھڑے مزدور ہاتھ ہلا ہلا کر نعرے لگا رہے تھے۔ ان کو کھڑا بھی تو اسی لئے کیا گیا تھا۔ توفیق اور دوسرے مزدور لیڈروں نے مل کر سیٹھ کو ہار پہنائے۔ سیٹھ صاحب بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ وہ اپنا وجود جو کسی طرح تین من سے کم نہ تھا سنبھالتے ہوئے دلہن کی طرح جلوس کے پہلو میں بڑھ رہے تھے۔ وہ ہلاتے ہوئے ہاتھ سے بار بار سلام، کرتے آخر اسٹیج پر پہنچے۔ مزدوروں میں بڑا جوش تھا۔ وہ اچک اچک کر سیٹھ صاحب کو دیکھ رہے تھے جیسے آج پہلی بار دیکھا ہو۔ سیٹھ صاحب بڑی شان سے کرسی صدارت پر بیٹھے اور سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر سرسری نگاہ ڈالی۔

سامنے نحیف و لاغر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میلے اور پھٹے کپڑوں میں یہ دق زدہ انسان ہنس رہے تھے۔ اپنی حالت سے بے پرواہ۔ کاش باوا آدم نے برتھ کنٹرول پر عمل کیا ہوتا۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔

صدر یونین توفیق نے استقبالیہ تقریر سے جلسہ کا آغاز کیا۔۔۔۔ سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے سیٹھ نے کہا "مزدور بھائیو" سیٹھ کے اس جملے پر ایسا معلوم ہوا جیسے سیٹھ نے مزدوروں کو اپنا بھائی کہکر قیامت برپا کر دی ہو۔۔۔۔ مزدور اور سیٹھ کے بھائی۔ پھر مزدور جتنی بھی تالیاں بجاتے کم تھا۔ سیٹھ اپنا بھاری بھرکم وجود سنبھالتے ہوئے ذرا آگے بڑھے۔ وہ آج کے لباس میں بڑے شاندار نظر آرہے تھے۔ تنگ موری کا پائجامہ۔ اس پر سرمئی رنگ کی ریشمی شیروانی بڑی جاذبیت پیدا کر رہی تھی وہ اپنی گول لیاقت کیپ سنبھالتے ہوئے بولے۔

"آپ نے جس محبت اور خلوص سے میرا استقبال کیا اس کے لئے میں آپ کا بے حد شکر گذار ہوں۔۔۔ مسٹر توفیق بڑے محنتی آدمی ہیں۔ پچھلے دنوں چند غلط لوگوں نے ہماری ملز میں ہڑتال کرانے اور آپ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ مگر مسٹر توفیق نے اس فتنے کو کامیابی سے دبا دیا۔۔۔۔۔ سیٹھ صاحب نے مجمع کو دیکھتے ہوئے فرمایا۔

"آج کا دن بڑا مبارک ہے آج آپ خوش ہیں اس لئے میں بھی خوش ہوں اس خوشی کے موقع پر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہمیشہ کی طرح آپکی خدمت کرتا رہوں گا میرے یہاں آپ کو نہ کوئی تکلیف ہو گی اور نہ پریشانی۔ آپ آرام سے روزی کما رہے ہیں۔ آپ کی تنخواہیں، وقت اور اوقات کار لیبر قوانین کے مطابق ہیں۔ آپکی یونین بھی ہے میں نے کبھی اسکی مخالفت نہیں کی۔ البتہ ابتدا میں منیجر نے ضرور چاہا تھا کہ یونین نہ بنائیں

اس کا خیال تھا کہ لوگ کہیں گے کہ سیٹھ ثاداب اپنے مزدوروں کو تکلیف دیتا ہے جبھی تو وہ یونین بنا رہے ہیں۔ بہرحال آپکی یونین بن گئی اور قائم ہے۔ مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہ دی۔ کیا میں نے آپکو ستایا؟" مجمع چیخا" نہیں.... نہیں" سیٹھ مسکرا کر بولے۔ "آپکو دوسری جگہوں سے زیادہ آرام ہے۔ اگر آدمی کو کھانا کپڑا اور طبی امداد نہ ملے تو اسکی صحت چند ہی یوم میں تباہ ہو جائے گی۔ آپ نے اپنی صحت دیکھی" جلسہ میں بیٹھے تمام مزدوروں کی نگاہیں اس جملہ پر جھک گئیں..... وہ اپنے پچکے ہوئے رخسار اور دھنسی ہوئی آنکھوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان کے کمزور جسم اور ان پر ابھری ہوئی نیلی نیلی رگیں گواہ تھیں کہ سیٹھ صاحب "سچ فرما رہے ہیں"۔ سیٹھ نے اپنے وجود کو دیکھا۔ جیسے ان کا یہ پہاڑ جیسا جسم مزدوروں کا ہو۔ اور بولے۔ اپنی صحت دیکھو اور کسی دوسرے مل کے آدمی کو دیکھو..... پھر فیصلہ کرو۔ ایسا کیوں ہے؟ صرف اس لئے کہ ہماری مل میں آپکو ہر آسانی میسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک لائق ڈاکٹر بھی موجود ہے۔ آخر میں آپکو یوم مئی کی مبارکباد پیش کرتے ہوئے آپ سے کہوں گا کہ آپ بھی اس مل کو اپنی سمجھتے ہوئے دل سے کام کرتے رہیں۔ آپکی اور ہماری کامیابی اسی میں ہے۔"

سیٹھ صاحب ڈائس سے چلے گئے مگر مجمع بڑی دیر تک نعرے لگاتا رہا اور پھر سکوت وجود کا عالم طاری ہو گیا..... مسٹر توفیق جلسے کے ختم کرنے کا اعلان کر رہے تھے..... مزدور منتشر ہونے لگے۔ چلتے چلتے ایک مزدور نے ایک ساتھی سے کہا۔

"ارے اپنا سیٹھ دوسری دنیا کا آدمی ہے۔ ایسا بھاگوان ادھر کہاں جو بولا سچ بولا۔ کدھر ہم لوگ کو ایسا آرام ملتا ہے" دوسرے نے کہا بیشک بیشک ٹھیک کہتے ہو۔ یہاں بڑا آرام ہے سکون ہے۔ اسی وجہ سے تو ہماری تندرستی اچھی ہے۔" بات ختم کر کے اس نے کھکارا اور بلغم تھوک کر ایک طرف چل دیا۔۔۔ اس کے تھوکے ہوئے دودھ ایسے سفید بلغم میں خون کی آمیزش صاف نظر آ رہی تھی۔

اطہر نفیس

اطہر تم نے عشق کیا کچھ تم بھی کہو کیا حال ہوا
کوئی نیا احساس ملا، یا سب جیسا احوال ہوا

ایک سفر ہے وادیٔ جاں میں تیرے درد ہجر کے ساتھ
تیرا درد ہجر جو بڑھ کر لذتِ کیف وصال ہوا

راہ وفا میں جاں دینا ہی پیش رووں کا شیوہ تھا
ہم نے جب سے جینا سیکھا، جینا کارِ مثال ہوا

عشق فسانہ تھا جب تک اپنے بھی بہت افسانے تھے
عشق صداقت ہوتے ہوتے کتنا کم احوال ہوا

راہ وفا دشوار بہت تھی تم کیوں میرے ساتھ آئے
پھول سا چہرہ کمہلایا اور رنگ حنا پامال ہوا

ماجد الباقری

سکھ کی آشا کرتے کرتے دکھ بندھن سب ٹوٹ گئے
جلتی ریت نے چھالے ڈالے ٹھنڈی سل پر پھوٹ گئے

غیر کوئی ہوتا تو شاید کوئی شکایت ہم کرتے
آج اپنے ہی دشمن بن کر دل کی پونجی لوٹ گئے

ہم جو اٹھے تو میخانے کی دھرتی کانپی پیر ڈگے
جن شیشوں کو ہاتھ لگایا وہ شیشے سب ٹوٹ گئے

بات کوئی سننے والا ہو تو ہم بھی کچھ بات کریں
پاگل پن کے سارے ساتھی پاگل پن میں چھوٹ گئے

سنگی ساتھی اک دیوانے کی بخشش کی راہوں میں
جتنی چھاتی کوٹ سکے ہیں اتنی چھاتی کوٹ گئے

جو قابو کی بات نہیں ہو کیسے بس میں آجائے
جتنے جتنے رو کے آنسو غم کے سوتے پھوٹ گئے

دل کے مقناطیس نے ماجد کھینچا ساری دنیا کو
آنے والے دل تک پہنچے چھوٹنے والے چھوٹ گئے

حیدر نقوی

صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ
آج کتنے مکانات ویران ہیں
کتنی ماؤں کے ارمان لوٹے گئے
کتنی بہنوں کی راکھی کو توڑا گیا
کتنی خوشیوں کے سامان لوٹے گئے
صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ
گلیوں کوچوں میں سڑکوں پہ دیوار پر
خون ہی خون ہے دیکھتا ہوں جدھر
کس نے کھیلی ہیں یہ خون کی ہولیاں
کس نے لوٹے ہیں اسطرح آباد گھر
صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ
گلیوں کوچوں میں دم توڑتے نوجواں
جن کے سینوں پہ گولی چلائی گئی
آہ یہ ملک و ملت کے فرزند ہیں
جن کے پاؤں میں بیڑی پہنائی گئی
صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ
آہ یہ کتنے ظالم محافظ ہیں جو
خوں بہاتے ہیں قانون کے نام پر
نام لیوا ہیں انسانیت کے مگر
قتل کرتے ہیں اور وں کے احکام پر
صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ
آج دہرائے گی خود کو تاریخ پھر
ان سے فرعون بھی آج شرمائے گا
اک سبق پائے گا ان سے نمرود بھی
بے عمل آج انسان ہو جائے گا
صبح روشن نہیں ہے شب غم ہے یہ



رزاق میکش

ذرے ذرے کا دل نچوڑیں گے
راز فطرت کا اک نہ چھوڑیں گے

چاند تارے اتار لائیں گے
کفر کہنہ مزاج توڑیں گے

ولولہ ہے تو عشق میں ہر گام
پنجہ ہائے رقیب موڑیں گے

زندگی کے کنول کھلائیں گے
رشتہ اک اک کلی سے جوڑیں گے

ہر جفا ہر ستم کو سہہ لیں گے
ان کو اپنا بنا کے چھوڑیں گے

ذکر دار و رسن ہو گر میکش
رخ دو دلانے ادھر ہی موڑیں گے



مشکل ایسا عذر ہے جسے تاریخ کبھی تسلیم نہیں کرتی ——— **سیموئیل**

مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ دشمنوں سے بچنے کا انتظام خود کر لونگا ——— **والٹیئر**

علم ایک بحرِ ناپید اکنار ہے جس کی تہہ بے شمار موتیوں سے بھری پڑی ہے اور میں اس کے کنارے پر ایک طفلِ خرد سال کی طرح گھونگے چن رہا ہوں ——— **نیوٹن**

اگر فیصلہ صرف حلف پر منحصر ہے تو زمین ہماری ہے ——— **گاندھی**

دیہات میں جو غریب لوگ ہیں انھیں جاہل مطلق نہ سمجھو اگر ان کو باقاعدہ تعلیم دی جاتی اور ان کے دل و دماغ کی نشو نما ہوتی تو عین ممکن ہے ان میں سے کوئی شیکسپیئر اور کوئی ملٹن ہوتا ——— **گورکی**

ظلم کرنا گناہ ہے اور ظلم سہنا گناہ کبیرا ——— **ہیرن**

آپ خواہ کوئی اور کچھ بھی ہوں اس چیز سے ضرور اتفاق کریں گے کہ جہاں ہر شخص بزعم خود "کچھ" ہوتا ہے وہاں دوسرا کوئی کچھ نہیں ہوتا۔ ——— **گلبرگ**

حضرت آدم کے عہد مبارک سے لے کر آج تک جو قانون بنائے گئے ہیں ان قوانین کا کام چھلکوں کی حفاظت کرنا اور دانوں کو دور پھینکنا رہا ہے ——— **آسکر وائلڈ**

دولت مندوں اور سرمایہ دار و نکی خیرات اور چندے سے چلنے والی سوسائٹیاں ہمیشہ دولت مندوں کی طاقت اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو قائم رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں وہ غریبوں کو صبر و تحمل کی تلقین و تبلیغ سے انقلابی جذبات کو ٹھنڈا کرتی رہتی ہیں تاکہ سرمایہ دار بے خوف و خطر ان کا خون چوستے رہیں ——— **برنارڈ شا**

موجودہ نظام میں اپنے پڑوسی کی جیب خالی کئے بغیر کوئی شخص اپنی جیب نہیں بھر سکتا ——— **ٹالسٹائی**

حقیر سے حقیر پیشہ اختیار کرنا ہاتھ پھیلانے سے بدرجہا بہتر ہے ——— **عثمان رضہ**

دنیا کا محنت کش طبقہ سرمایہ داری نظام کے خلاف کمال بہادری سے نبرد آزما ہے اور یہ آخری لڑائی شروع ہو گئی ہے، یہ معرکۂ حق و باطل ہے اس میں غیر جانبداری موت اور غداری ہے ——— **رومن رولاں**

تاروں بھرے آسمان کی درخشندہ فضا سیاروں کی مسلسل گردش، فطرت کی رات دن کی انتھک کشمکش کس کام کی اگر انسان اس دنیا میں آزادی اور خوشی سے سانس نہیں لے سکتا اور اپنے ماحول کے ساتھ ہمقدم ہو کر نہیں چل سکتا ——— **گوئٹے**

مجھے ڈرائنگ روم اور دیوان خانوں میں بیٹھ کر بکواس کرنے والے سیاست دان کی رائے کی رتی بھر پروا نہیں میں تو صرف ایک ہی طبقہ کی رائے کی پروا کرتا ہوں اور وہ طبقہ کسانوں کا ہے۔ ——— **نپولین**

آج کل بہت سے گناہ اور خرابیاں تو قومی وقار کے نام پر کیجاتی ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ "قومی وقار" دراصل حکمران طبقہ کا جماعتی وقار ہوتا ہے۔ ——— **چھبیلداس**

سفیر ——— اس ایماندار شخص کو کہتے ہیں جسے سلطنت کی خاطر ہر روز جھوٹ بولنے کے لئے دوسرے ملک میں جلاوطن کر دیا گیا ہو ——— **وٹن**

کہتے ہیں جہالت بے فکری کا گہوارہ ہے اور بے فکری راحت و آرام کا بستر! یہ قول ان لوگوں کے نزدیک صحیح ہے جو مُردوں کی طرح پیدا ہوتے اور جمادات کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ——— **جبران**

اگر دیکھنا ہو کہ کسی عہد کی سیاسی یا فکری تاریخ کیا ہے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس عہد میں معاشی پیداوار اور مبادلہ کے طور طریق کیا تھے اور ان معاشی عناصر سے جو معاشرہ وجود میں آیا تھا وہ کس قسم کا تھا۔ اس لئے کہ یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر کسی قوم کی سیاسی و فکری تاریخ کی عمارت استوار ہوتی ہے اور یہی وہ معیار ہے جس کی روشنی میں اس تاریخ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ——— **مارکس**

حقیقت یہ ہے کہ اضلاع متحدہ امریکہ میں (دنیا کے دیگر ممالک میں بھی) نوے فیصدی امراء نے جائدادیں بے ایمانی، حرامکاری اور بدکاری سے پیدا کی ہیں۔ کروڑپتی بننے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔ ——— **کروپاٹکن**

ادب ——— نام ہے انسان کے خیالات و جذبات کے اظہار کا۔ اور ان خیالات کی بنیاد تجربات پر ہوتی ہے۔ یعنی انکی جڑیں زندگی کے مادی حالات و عوارض میں دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ ——— **مجنوں گورکھپوری**

انتقام لینے میں اور محبت کرنے میں عورت مرد سے زیادہ ظالم ہوتی ہے۔ ——— **نیتشے**

خبرنامہ

حبیب ٹیکسٹائل ملز ورکرز یونین کے مزدور دشمن عہدیداروں کو برطرف کر دیا گیا

نئے عہدیداروں کا انتخاب

کراچی (نمائندہ منشور) ۱۱ اپریل بروز اتوار پانچ بجے شام حبیب ٹیکسٹائل ملز کے مزدوروں کا ایک غیر معمولی اجلاس عام زیر صدارت جناب صالحین صاحب منعقد ہوا۔ اجلاس کی کارروائی شروع کرتے ہوئے محمد شکیل صاحب نے حاضرین کو بتایا کہ ۶۳ء کی عام ہڑتال کے وقت منتظمین نے مزدوروں سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ یہ سازش کر چکے تھے کہ ہر قیمت پر مزدوروں کی طاقت کو کچل دیا جائے اس مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف یہ کہ بے ایمان لوگوں کو خرید کر مزدوروں میں بددلی پھیلائی اور ان کے اتحاد کو توڑا بلکہ جو لوگ ان سے مقابلہ کر سکتے تھے انہیں مختلف مقدمات میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا۔ اس کے علاوہ رجسٹرار ٹریڈ یونینز پر دباؤ ڈال کر ان یونینوں کے رجسٹریشن منسوخ کرا دیئے جنہوں نے ہڑتال کی تھی ان یونینوں میں حبیب ٹیکسٹائل ملز لیبر یونین بھی شامل ہے۔ یونین کے رجسٹریشن کی منسوخی اور چاچا علی جان صدر یونین کی گرفتاری سے فائدہ اٹھا کر یونین کے تمام سرگرم کارکنوں کو ملازمت سے نکال دیا۔ جن مزدوروں نے حساب لینے سے انکار کیا انہیں پولیس کے ذریعہ زبردستی حساب لینے پر مجبور کیا گیا۔ ان کارروائیوں سے ہر مزدور کو اپنی ملازمت خطرے میں نظر آنے لگی۔ اور اس طرح ایک خوف وہراس کی فضا پیدا ہو گئی۔

اس فضا سے فائدہ اٹھا کر مالکان نے چند خود غرض مزدوروں کو خریدا اور ان کے ذریعہ اپنے اثر ورسوخ اور دولت سے کام لیکر ایک یونین حبیب ٹیکسٹائل ملز ورکرز یونین کے نام سے رجسٹرڈ کرالی جس کا رجسٹریشن نمبر ۱۱۹۱ ہے یونین کے رجسٹرڈ ہونے کے بعد مالکان نے سپروائزروں اور جابروں کے ذریعہ تمام مزدوروں کو اس پاکٹ یونین کا ممبر بننے اور چندہ دینے پر مجبور کیا۔ جس کے نتیجے میں تقریباً تمام مزدور اس یونین کے ممبر بنے۔

عام مزدوروں کے ممبر بننے کے بعد یونین کے مفاد پرست عہدیداروں سے بار بار مطالبہ کیا جاتا رہا کہ وہ یونین کے عام انتخابات کروائیں لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ اگر انتخابات کرائے گئے تو حبیب ٹیکسٹائل ملز کے مزدور چمچوں کے بجائے ایماندار مزدوروں کو اپنا نمائندہ چنیں گے۔

اس صورت حال سے تنگ آ کر چند مزدور کارکنوں نے بڑی مشکل سے یونین کا دستور حاصل کیا اور اس کی دفعہ ۲۵۔ ذیلی دفعات ا۔ ب۔ ج۔ د۔ کے تحت صدر اور جنرل سکریٹری کو یونین کی جنرل باڈی کا ہنگامی اجلاس بلانے کا نوٹس دیا۔ اس نوٹس پر ایک ہزار ستاون ممبروں کے دستخط تھے۔ دستور کی رو سے صدر اور جنرل سکریٹری کو نوٹس ملنے کے ۲۱ دن کے اندر اندر لازمی طور پر اجلاس بلانا تھا یہ نوٹس جو کہ انہیں رسیدی رجسٹری ڈاک سے بھیجا گیا تھا انہوں نے دس تاریخ کو وصول کیا اور ۲۱ دن ۳۱ مارچ کو پورے ہو گئے۔ لیکن انہوں نے اجلاس نہیں بلایا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وہ تمام ممبروں کا سامنا نہیں کر سکتے اور ان پر لگائے گئے الزامات کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا

دستور کی موجودہ دفعات میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے کہ اگر عہدیدار بے ایمانی پر آمادہ ہوں اور اجلاس نہ بلائیں تو مزدور خود یہ اجلاس منعقد کر لیں۔ اسی بنا پر آج کا یہ اجلاس بلایا گیا۔ اس اجلاس کے تمام فیصلے دستوری اور قانونی ہوں گے اور ان کی پابندی یونین کے تمام ممبران پر لازمی ہو گی۔

محمد شکیل کے بعد رحیم گل نے جلسے سے خطاب کیا اور بتایا کہ وہ اس یونین میں صرف اس امید پر شامل ہوئے تھے کہ یونین کے بغیر مزدوروں کے مفاد کا تحفظ ممکن نہیں ہے لیکن اس یونین میں شامل ہونے کے بعد انہیں پتہ چلا کہ "پاکٹ یونین" مل مالکان کے ہاتھ میں مزدوروں کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ انہوں نے بتایا کہ یونین کے عہدیدار کی حیثیت سے انہوں نے کوشش کی کہ یونین مزدوروں کی صحیح نمائندہ جماعت وتنظیم بن جائے لیکن بے ایمان اور خود غرض لوگوں نے نہ صرف یہ کہ ان کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ بلکہ انہیں طرح طرح کی دھمکیاں دیں۔ اور آخر انہوں نے مجبور ہو کر نائب پروپیگنڈہ سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ حاضرین نے اس اعلان کا پرجوش تالیوں سے خیر مقدم کیا۔

اس کے بعد اے نظیر صاحب نے قرارداد عدم اعتماد پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ نئے عہدیداروں کا انتخاب کریں۔ محمد شکیل صاحب نے اے نظیر صاحب کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا جس کی تائید یوسف خان نے کی۔ چونکہ کوئی دوسرا نام صدارت کے لئے پیش نہیں ہوا اسلئے اے نظیر صاحب بلا مقابلہ صدر منتخب ہو گئے۔ اسکے بعد صدر جلسہ نے نئے منتخب شدہ صدر سے درخواست کی کہ وہ صدارت کے فرائض انجام دیں۔ اے نظیر صاحب کے صدارت سنبھالنے کے بعد مندرجہ ذیل عہدیداران بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ نائب صدر۔ عزیز الرحمن اور معشوق علی۔ جنرل سکریٹری۔ محمد شکیل۔ جوائنٹ سکریٹری رحیم گل اور میاں بادشاہ۔ خزانچی یوسف خان۔ نائب خزانچی۔ صاحب خان۔ پروپیگنڈہ سکریٹری یٰسین نائب پروپیگنڈہ سکریٹری۔ علی جان۔ آفس سکریٹری حنیف اللہ۔ ان کے علاوہ بیس کھاتہ نمائندے بھی چنے گئے

جی۔ کے۔ این۔ میں

ورکرس کمیٹی کا انتخاب!

کورنگی گیسٹ کین اینڈ نیٹلفولڈز پاکستان لمیٹڈ میں گزشتہ ہفتہ انتخاب ہوئے جس میں تمام یونین کے عہدیدار منتخب ہو گئے ہیں۔ مسٹر سید علی امام اور لئیق احمد پہلے ہی سے بلا مقابلہ منتخب ہو گئے تھے۔ مسٹر گلزار احمد نائب صدر یونین کا مقابلہ ایک امیدوار نے کیا لیکن اسے صرف تین ووٹ ملے۔ نتیجہ کے طور پر تینوں امیدوار منتخب قرار دیئے گئے مذکورہ تینوں افراد۔ جی کے۔ این۔ کورنگی ورکرس یونین کے سینئر عہدیدار ہیں مزدوروں میں اس انتخاب پر مسرت کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

محنت کشوں کے لیل و نہار



کراچی ۱۸ مارچ ۱۹۶۵ء۔ مسلم کمرشیل بنک اسٹاف یونین کراچی کے بنک مزدوروں کی ایک بہت ہی سرگرم تنظیم ہے۔ مسلم کمرشیل بنک کراچی کے محنت کشوں کی یہ انجمن پچھلے دو سال سے بڑی سرگرمی سے اپنے اراکین کے حالات کار کو بہتر سے بہتر بنانے اور ان میں طبقاتی شعور بیدار کرنے کی جد وجہد کر رہی ہے۔

۱۸ مارچ ۱۹۶۵ء کو ڈینسو ہال میں یونین کا تیسرا سالانہ جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں اراکین کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ جلسۂ عام میں پچھلے سال کے حسابات منظور کئے گئے اور سالانہ رپورٹ کی منظوری دی گئی اس کے بعد انتخابات ہوئے۔

انتخابات کے بعد نئے عہدیداروں نے حلفِ وفاداری اٹھایا اور یونین کے صدر جناب ضیاء الحق۔ نائب صدر حسین عبدالستار اور سکریٹری جنرل نے مختصر تقریریں کیں جلسۂ عام میں تنخواہوں اور اوور ٹائم کی شرح پر نظرِ ثانی کرنے مہنگائی بھتہ کو بنیادی تنخواہ میں شامل کرنے ملازمین اور ان کے اہل خاندان کو مکمل طبی سہولتیں فراہم کرنے۔ ملازمین کو ترقی کے مناسب مواقع دینے رہائشی مسئلہ حل کرنے یونین کو دفتر مہیا کرنے زیرِ تعلیم ملازمین اور ملازمین کے زیرِ تعلیم بچوں کے لیے تعلیمی فنڈ قائم کرنے چوکیداروں اور ڈرائیوروں کو اوور ٹائم اور ہفتہ واری چھٹی دینے برطرف شدہ ڈرائیور اللہ دتہ کو بحال کرنے اور برانچ منیجر مسٹر زبیری اور دیگر دو افسران کی ثابت شدہ مزدور دشمن سرگرمیوں کے خلاف قدم اٹھانے کے مطالبات منظور کئے گئے۔



پچھلے جلسۂ عام کی قرارداد کے مطابق ۳ مارچ ۶۵ء کو ہڑتال کا بیلٹ لینے پر بھی اکثر مقررین نے زور دیا۔

جلسۂ عام نے ہندوستان کو سامراجی ملک کی بے پناہ فوجی امداد اور مشرقی ایشیا میں امریکہ و برطانیہ کی اشتعال انگیز سرگرمیوں کے خلاف افرو ایشیائی ممالک کا متحدہ محاذ بنانے کی قرارداد کی بھی منظوری دے دی۔

اس کے علاوہ پاکستان میں غیر ملکی بنکوں کو قومیانے مزدور تنظیموں کے مشورے سے مزدور قوانین بنانے اور شاپس ایکٹ کی جگہ تجارتی اداروں کے ملازمین کے لئے بہتر اور ترقی پسند قوانین بنانے کی قراردادیں بھی منظور کی گئیں۔

جلسۂ عام سے مغربی پاکستان مزدور کارکن کانفرنس کے سکریٹری اور پاکستان اسیکورٹی پریس ایمپلائیز یونین کے صدر جناب محمد یامین۔ مزدور انجمنوں کی مجلس رابطہ کے سکریٹری جناب واحد بشیر صاحب اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور پی آئی اے کے مزدوروں کے نمائندوں نے بھی خطاب کیا اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

نئے عہدیداروں کے نام یہ ہیں

۱۔ صدر۔ جناب ضیاء الحق
۲۔ نائب صدر۔ حسین عبدالستار صاحب
۳۔ سکریٹری جنرل۔ اشرف حسین
۴۔ سکریٹری۔ منور خان۔
۵۔ رابطہ سکریٹری۔ احسن یوسف
۶۔ فنانس سکریٹری۔ محمد انور۔
۷۔ کونسلرز۔ ابوبکر عبدالکریم۔
۸۔ 〃 قادر حسین غوری
۹۔ 〃 عبدالرزاق عثمان
۱۰۔ 〃 عبدالسلام
۱۱۔ 〃 عبدالرشید
۱۲۔ 〃 مظفر حسین
۱۳۔ 〃 شبیر علی شاجن

برانچ سکریٹریز

۱۔ شیخ محمد صدیق۔	ہیڈ آفس
۲۔ سید نجم الدین۔	قمر ھاؤس
۳۔ محمد قاسم عبداللہ	میری ویدر ٹاور برانچ
۴۔ زین الدین محسن بھائی۔	جوڑیا بازار
۵۔ عبدالرزاق افغانی۔	میکلوڈ روڈ
۶۔ عبدالرشید	ٹمبر مارکیٹ
۷۔ احمد فاروق	صدر
۸۔ عبدالشکور	ایس آئی ٹی ای

سنگر انڈسٹریز لیبر یونین کے عہدیدار

مورخہ ۲۸ مارچ کو سنگر انڈسٹریز کے مزدوروں کے جلسۂ عام میں سنگر انڈسٹریز لیبر یونین کا قیام عمل میں آیا جس میں مندرجۂ ذیل افراد کو یونین کا عہدیدار منتخب کیا گیا۔ صدر، عبدالحق۔ نائب صدر محمد اعظم جنرل سکریٹری، ابن ایوب۔ جوائنٹ سکریٹری نثار احمد پروپیگنڈہ سکریٹری۔ نذیر احمد، خازن سردار زماں۔ ممبران مجلس عاملہ۔ عبدالمنان۔ غلام حیدر۔ خیال گل۔ شمروز خاں۔ غلام رسول۔ محمد اسحاق۔ محمد فرید۔ محمد ریاض۔ ناظم الدین۔

سنگر انڈسٹریز کورنگی کے مزدوروں نے ہڑتال کا نوٹس دے دیا

سنگر انڈسٹریز لیبر یونین کے کاغذات رجسٹریشن کیلئے داخل کر دیئے گئے

مصالحتی آفیسر مسٹر این اے تالپور نے فریقین کے درمیان مصالحت کی بات چیت شروع کر دی

کورنگی انڈسٹریل ایریا کی سب سے بڑی فیکٹری اور مشہور سنگر سلائی کی مشین بنانے والی انڈسٹریز "سنگر انڈسٹریز (پاکستان) لمیٹڈ" میں یونین کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یونین نے رجسٹرار صاحب ٹریڈ یونین کو یونین کے کاغذات برائے رجسٹریشن داخل کر دیئے ہیں۔ نیز ۲۸ مارچ ۶۵ء کو ایک جلسہ عام میں سنگر انڈسٹریز کے مزدوروں نے پانچ منتخب نمائندوں کے ذریعہ اپنے مطالبات پر ایک ہڑتالی نوٹس بھی دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ یونین کے ایک نمائندے نے ہمیں بتایا کہ مورخہ ۱۲ اپریل کو ایک ہڑتالی نوٹس دیا گیا تھا جس پر مصالحتی آفیسر مسٹر این۔ اے تالپور۔ ڈپٹی ڈائریکٹر لیبر ویلفیئر نے مصالحتی کارروائی کے لئے ایک میٹنگ اپنے دفتر میں طلب کی تھی یہ میٹنگ منتظمین فیکٹری کی درخواست پر مورخہ ۲۰ اپریل ۶۵ء تک کے لئے ملتوی کر دی گئی۔ ہڑتالی نوٹس دینے والے نمائندوں نے ایک بات چیت کے دوران ہمارے نمائندے کو بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منتظمین ہمارے مطالبات پر مصالحتی کارروائی کے دوران کوئی فیصلہ کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں انہوں نے بتایا کہ سنگر انڈسٹریز کورنگی مزدور پوری طرح متحد ہیں اور چاہتے ہیں کہ بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے ان کے مطالبات منظور کر لئے جائیں۔ لیکن اگر منتظمین اپنے سابقہ مزدور دشمن رویہ پر قائم رہے تو مزدور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کریں گے۔ مزدوروں نے نو مطالبات پیش کئے ہیں جن میں مسٹر عبدالحق۔ صدر یونین کی بحالی بونس۔ تنخواہوں میں اضافہ۔ مکان کا کرایہ۔ اتوار کی چھٹی تنخواہ کے ساتھ دینے اور چھٹیوں میں اضافہ کرنے کے مطالبات شامل ہیں۔

ہوزری ملز مالکان کی طرف سے انتقامی کارروائی

اور معاہدوں کی خلاف ورزی کی مذمت!

کراچی۔ (نمائندہ منشور) کراچی ہوزیری ملز ورکرز یونین کا ایک غیر معمولی جلسہ عام ۱۶ اپریل کی شام ۵ بجے منعقد ہوا جس کی صدارت جناب انوار خاں صاحب نے کی۔ جلسے نے سب سے پہلے ایک قرارداد کے ذریعے جناب انوار خاں صاحب کو اپنے حلقے سے بی۔ ڈی ممبر منتخب ہونے پر مبارکباد دی اور اس توقع کا اظہار کیا کہ وہ اپنی اس حیثیت میں بھی مزدور طبقہ کی خوشحالی کے لئے جدوجہد کریں گے اس کے بعد مقررین نے اس امر پر تشویش کا اظہار کیا کہ بونس کی شرح میں کمی سے مشتعل ہو کر مل مالکان ہوزیری کی صنعت میں بحران پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اس مقصد کے تحت انہوں نے مزدوروں کو پریشان کرنا۔ غیر قانونی طور پر انہیں علیحدہ کرنا اور یونین سے کئے ہوئے معاہدوں کی خلاف ورزی کرنا شروع کر دیا ہے۔ انہوں نے مل مالکان کو مشورہ دیا کہ وہ انہیں نفع کما کر دینے والے مزدوروں کو ان کے حقوق سے محروم کر کے صنعتی امن کو برباد کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ورنہ نتائج کی تمام تر ذمہ داری ان کے سر ہوگی اجلاس سے اور مزدوروں کے علاوہ فخر الدین صدیقی صاحب اور محمد سلیم نے خطاب کیا

ڈائر ٹیکسٹائل اینڈ پرنٹنگ ملز میں مزدوروں پر ظلم

وزیادتی کا سلسلہ حسب معمول جاری ہے

کراچی۔ نمائندہ منشور۔ ڈائر ٹیکسٹائل اینڈ پرنٹنگ ملز کے مالکان نے اپنی دیرینہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس بار بھی عید سے صرف ایک روز پہلے حق رضا کے پیسے تقسیم کئے۔ چونکہ مالکان نے خود ایک یونین رجسٹرڈ کروا رکھی ہے جس کا آج تک نہ تو کوئی انتخاب کبھی ہوا ہے اور نہ ہی مزدور یونین کے عہدیداروں کے ناموں سے واقف ہیں اس لئے مالکان بے کھٹکے جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اس لئے اس بار بھی حق رضا کے پیسے مستقل مزدوروں کی ایک تہائی سے بھی کم تعداد کو ادا کئے گئے ہیں۔

پچھلے سال بھی اسی طرح کی صورت پیدا ہو گئی تھی اور مزدوروں نے اپنے پانچ نمائندے منتخب کر کے ہڑتال کا نوٹس دیا تھا اس نوٹس پر محکمہ محنت نے یہ قانونی اعتراض اٹھایا تھا کہ جس مل میں رجسٹرڈ یونین موجود ہے وہاں پانچ نمائندوں کو ہڑتال کا نوٹس دینے کا حق نہیں۔ صرف اس یونین کا جنرل سکریٹری دے سکتا ہے یہ مسئلہ بہت اہم تھا کیونکہ اس طرح مالکوں کو یہ اختیار مل جاتا تھا کہ وہ ایک پاکٹ یونین بنا لیں اور مزدوروں کو ان کے حقوق سے محروم کرتے رہیں۔ اسلئے ڈائر کے مزدوروں نے یہ معاملہ ہائی کورٹ میں لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ہائی کورٹ میں رٹ کی اس درخواست کی ابتدائی سماعت مکمل ہو گئی ہے اور جسٹس انعام اللہ خاں اور جسٹس وحید الدین احمد نے اسے باقاعدہ سماعت کے لئے منظور کر لیا ہے۔ مزدور نمائندوں کی درخواست پر معزز جج صاحبان نے پیشی کی تاریخ جلد مقرر کرنے کا حکم صادر فرما دیا ہے۔ ڈائر کے مزدور اپنی اس رٹ کے فیصلہ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی آزاد یونین بنانے کی کوششوں کو فی الحال اس لئے ملتوی کر دیا ہے کہ یونین کے رجسٹریشن کے سلسلے میں امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے اور ان کی ایک درخواست مسترد ہو گئی ہے

تمام مزدور یونینوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے یہاں کی خبریں بغرض اشاعت روانہ کریں۔ منشور کے صفحات حاضر ہیں!

عامل صحافیوں کی طرف سے

مالکان اخبار کے رویّہ اور قرارداد کی مذمت

کراچی ۲۳/اپریل۔ کل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی اور کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرس نے حال ہی میں حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ صحافیوں کے اجرت بورڈ ایوارڈ کو کالعدم قرار دے۔ نیز دوسرے ایوارڈ کا نفاذ کیا جائے اس مطالبہ کی وجوہ یہ بتائی گئی ہیں۔ کہ اخباری صنعت کے نفع میں کمی ہوئی۔ نیز کارکن صحافیوں کی کارکردگی گر گئی۔ APNS نے اس سلسلہ میں حکومت کے اس اصلاحی اقدام کو کالعدم قرار دینے کے لئے ایک بڑا کمزور سہارا لیا ہے موجودہ حکومت کی طرف سے نافذ کردہ۔ صحافیوں کا آرڈی ننس۔ نیز صحافیوں کے اجرت بورڈ کے نفاذ کے بعد عامل صحافیوں کی کارکردگی نہ صرف بڑھی ہے بلکہ اخباری صنعت نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ تمام اخبارات کی اشاعت اور ان کا گیٹ اپ اور طباعت بہتر ہو گئی اور ادھر مالکان اخبارات نے اشتہاروں کے نرخ بڑھائے ہیں جن سے آمدنی بڑھی ہے۔ یہ عذر بالکل تاجرانہ اور خامکارانہ ہے کہ عامل صحافیوں کی اجرتیں مقرر کرنے سے ان کی کاردگی گر گئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اخباری صنعت کے مفاد اور اس کی ترقی کے لئے حکومت کو موجودہ ایوارڈ سے بہتر اجرت ایوارڈ کا جلد از جلد نفاذ کرنا چاہیئے۔

انجمن صحافیان کراچی اور کل پاکستان وفاق صحافیان PFUJ نے گہری تشویش ظاہر کی ہے اور حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مالکان اخبارات کی اس سازش کو ناکام بنائیں جس کا مقصد صدر ایوب کی اصلاحات کو ناکام کرنا ہے۔ کراچی سے مسٹر منہاج برنا سکریٹری KUJ اور مسٹر سلطان احمد صدر KUJ نے صدر ایوب کو تار دیئے ہیں تاکہ اجرت بورڈ پر نہ صرف عمل ہو بلکہ بہتر ایوارڈ عامل صحافیوں کے مفاد میں نافذ کیا جائے

محنت کشو اُٹھو!



ضیا نظیری

ایسے نہ باز آئیں گے سرمایہ دار لوگ
نرمی سے اب نہ کام چلے گا جفا کشو!

محنت کشوں نے جب بھی کیا اپنا حق طلب
زردار ظالموں نے بہایا ہے اُن کا خوں
زنداں کو بھینٹ کتنے ہی محنت کشوں کی دی
رکھنے کو اپنے آگے جفا کش کا سر نگوں

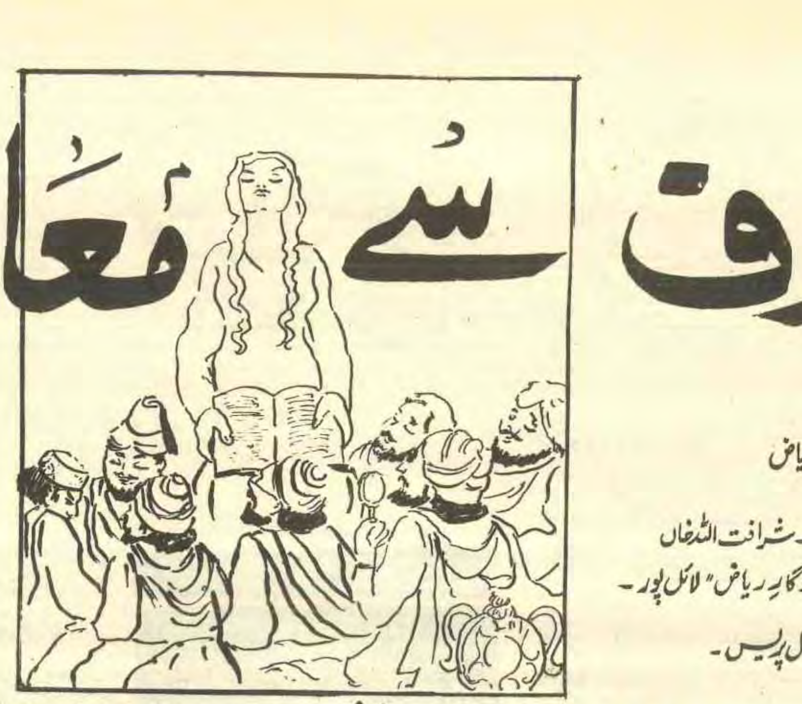
کتنی ہی دلہنوں کا اجاڑا گیا سہاگ
کتنے ہی والدین کے ٹکڑے کئے جگر
معصوم کتنے کر دیئے لاوارث و یتیم
یہ تشنگی لہو کی نہ ان کی بجھی مگر

ان کو لگی ہوئی ہے تمہارے لہو کی چاٹ
زر کی درندگی کا نشہ اُن پہ ہے سوار
سفاکیت میں ڈوبے ہوئے ہیں یہ سر بسر
کیسے جفا کشوں کے دلوں کی سنیں پکار

زر کے نشہ میں چور یہ آمادۂ ستم
تم کو سمجھ رہے ہیں خریدا ہوا غلام
بے بس سمجھ رہے ہیں تمہیں خود کے سامنے
ہنستے ہیں سادگی پہ تمہاری یہ صبح و شام

اٹھو کہ آج اٹھ کے جلاد و نظام زر
سرمایہ داریت کے بتوں کو اکھیڑ دو
زردار ظالموں کے لہو سے مناؤ جشن
ایوان و قصر زر کے خزانوں کو لوٹ لو

حرف سے معانی تک



خالق :- احمد ریاض

طابع و ناشر :- شرافت اللہ خاں
برائے "مجلسِ یادگارِ ریاض" لائل پور۔

مطبع :- استقلال پریس۔

سول ایجنٹ :- الجدید - لاہور

قیمت :- ۵/۰۰ روپے

صفحات :- ۲۳۲

احمد ریاض

موجِ خوں

موجِ خوں ۔ جواں فکر۔ جواں سال اور جواں مرگ شاعر احمد ریاض کا مجموعۂ کلام ہے، جسے اس کے انتقال کے بعد "مجلسِ یادگارِ ریاض" نے مرتب کر کے شائع کیا ہے یہ بات بذاتِ خود بڑی حوصلہ افزا ہے کہ موقعہ پرستی اور سمجھوتہ بازی کی مذموم روش عام سے ہٹ کر سچائی۔ خلوص اور خودداری کی شکل۔ پرخار۔ صبر آزما مگر باوقار راہ کو اپنانے والے شاعر کو یاد رکھنے اور اس کے کلام کی اشاعت کے ذریعے اس کے شعلۂ احساس سے دوسروں کو گرمانے کی ذمہ داری کو منظم طریقے پر پورا نے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش خاص طور پر ایسے حالات میں زیادہ اہمیت کی حامل بن جاتی ہے جبکہ الفاظ کے بازیگروں اور لفظ و بیان کے سوداگروں کی نظریں انعامات کی نقد رقوم پر مرکوز ہوں اور فنی تقاضوں اور خود اپنے احساس سے زیادہ منصفین کی پسند کو فن کا محرک اور فن کا معیار سمجھا جانے لگا ہے۔ اپنی اس پرخلوص اور کامیاب کوشش پر "مجلسِ یادگارِ ریاض" کے کارکن قابلِ مبارکباد ہیں۔

یہ مجموعہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ نظمیں اور غزلیں۔ اور ایسے دور کی تخلیق ہیں جبکہ آزادی کی جدوجہد کے دوران کئے ہوئے وعدے ایک ایک کر کے توڑے جا رہے تھے اور لوگوں نے جو توقعات قائم کی تھیں۔ وہ حسرتوں میں تبدیل ہو رہی تھیں حالات نے فنکاروں کو ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ ایک طرف جھوٹی عزت اور ناپائیدار شہرت کی منزل تھی جس تک حکمران طبقے کی دلالی کے راستے پہنچا جا سکتا تھا۔ دوسری منزل انسانیت دوستی۔ خلوص اور سچائی کی تھی۔ معاشی بدحالی اور قید و بند کی صعوبتوں سے گزر کر ہی اس منزل تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اس ملک کے دوسرے دیانتدار با شعور فنکاروں کے ساتھ احمد ریاض نے بھی دوسری منزل کو اپنا نصب العین بنایا اور اس جرأت کے جرمانے میں اپنی زندگی دیدی۔

فن میں اپنے رویئے اور زندگی میں اپنی اس روش کو اپنانے کا فیصلہ،

احمد ریاض نے کسی جذباتی ردِ عمل کے نتیجے میں نہیں بلکہ اپنے سماجی تاریخی اور ادبی شعور کی بنیاد پر کیا تھا۔ اس کا ثبوت اسکی وہ باون نظمیں اور باون ہی غزلیں ہیں جو اس مجموعے میں شامل ہیں۔

ان نظموں اور غزلوں کے پیچھے جو ذہنی کیفیت ہے اس سے وہ بے چین روح، جھلک رہی ہے جو سماجی اور تاریخی شعور سے مسلح ہے۔ احمد ریاض بھی دوسرے شاعروں کی طرح (یہاں شاعر سے مراد مکھی پر مکھی مارنے والے کاریگر نہیں ہیں) حساس ہے۔ لیکن وہ حیات و کائنات کے متعلق ایک سائنسی نکتۂ نظر کا حامل ہے اس لئے اس کا فکری مرکز اسکی اپنی ذات نہیں بلکہ وہ مکمل اکائی ہے جسکی ایک کسر اسکی اپنی ذات بھی ہے۔ اس کے احساس پر اسکی فکر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حالات کی ناسازگاری اس کے احساس کو مجروح کر کے اسمیں یاسیت اور فرار پسندی نہیں پیدا کر پاتی نہ ہی اسے اپنی ذات



کے تنگ حلقے میں قید کر سکتی ہے۔ نہ ہی سطحی اور فروعی مسائل اسکی توجہ اپنی طرف مبذول کروا سکتے ہیں۔ البتہ ہر وہ مسئلہ، ہر وہ واقعہ اور حادثہ اس کے ذہن و احساس کو مشتعل کرتا ہے جو عالم انسانیت کی منزلِ مساوات کی راہ میں رکاوٹ بنے چاہے وہ "اقوام متحدہ" ہو۔ "قراداد مقاصد ہو" "چھٹا دریا" ہو۔ "کہانی۔ انسان کی کہانی" ہو یا "نئی دیوار چین" یہ اشتعال اس کے لہجے میں تندی اور احساس میں تلخی بھر دیتا ہے۔ مگر احمد ریاض ایک باشعور ترقی پسند شاعر ہے۔ اس کے لہجے میں تندی اور احساس کی تلخی پر بھی اس کا بے کراں خلوص اور انسانیت کے مستقبل پر اس کا غیر متزلزل یقین حاوی ہے۔

احمد ریاض قیود زمان ومکان سے آزاد شاعر نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسی ہر کوشش اسے "وجہ تفریح" تو بنا دیگی مگر فن کار نہیں۔ اس لئے اسکے ہاں راوی۔ چناب۔ ہیر۔ سوہنی۔ رانجھا۔ مہیوال۔ گلیاں۔ اور دریچے اپنے تمام پس منظر اور کیفیات کے ساتھ موجود ہیں۔ نہ وہ اپنے "آس پاس" سے بے خبر ہے۔ نہ "کل اور آج" سے۔ اس کے ذہن نے درجنوں سے فرد تک کا فاصلہ طے کیا ہے۔ وہ "ارتقا" کا منزل آشنا اور "نئی تاریخ" کے تقاضوں سے واقف ہے، نہ تو وہ "نئی غلامی" قبول کرنے کو تیار ہے۔ نہ "خیال پرستوں سے اتحاد کرنے"

احمد ریاض اپنے تند لہجے اور تلخ احساس کے باوجود ایک شاعر ہے اور شاعر حسن سے اپنا رشتہ کبھی نہیں توڑ سکتا۔ وہ سچائی کا پرستار اسلئے ہے کہ صداقت اصل حسن ہے اور اپنی اس شاعرانہ حسن پرستی کا اظہار یوں کرتا ہے۔

تمام راندۂ آداب خسروی سنبھلے
ہوا شکست طلسم قیود دار و رسن
یہ کائنات نوید سحر سے جاگ اٹھی
ردائے تیرگیٔ شب سے پھوٹتی ہے کرن
(عوامی فنکار)

زندگی مرتی تمناؤں کی قبر
ٹھوکریں کھاتی امیدوں کا مزار
زندگی ناکام خوابوں کی خزاں
تلخ ارمانوں کی کجلائی بہار
(عظیم فنکار ـــ منٹو)

فضاؤں کی طرب خیزی بہاروں کی خاکاری
گلوں کا رنگ غنچوں کی مہک کلیوں کی رعنائی
سجیلی پتیوں کی تال پر شاخوں کے ہچکولے
نشیمن در نشیمن قمریوں کی نغمہ پیرائی
شکوہ ساغر و مینا، عروج نشۂ صہبا
غرور خندۂ ساقی، شعور بادہ پیمائی

میں اکثر سوچتا ہوں، کیوں یہ سب کچھ اک کہانی ہے
یہاں کوئی حقیقت کیوں حقیقت تک نہیں پہنچی
کوئی جادو، کوئی نغمہ، کوئی نشہ، کوئی خوشبو
کوئی خوبی یہاں کیوں اپنی فطرت تک نہیں پہنچی
(معاشرہ)

کتنے چٹختے شاخچے جورِ خزاں سے سرد ہیں
کتنی بہاریں دفن ہیں ہر سر چٹختے پھول میں
کتنے سکھوں کی آنچ ہے، کتنے دکھوں کی آگ ہے
بکھرے دلوں کی راکھ میں بیتے جگوں کی دھول میں
(دھوپ چھاؤں)

تیری آنکھوں کے گرداب سونے ہوئے
تیری پلکوں کی جھالر بھی کجلا گئی ـــ!
تیری زلفوں کی مہکار جھوٹی ہوئی
تیرے ماتھے کی افشاں بھی شرما گئی
(میں اور تو)

یہ اونچے شبستاں یہ خوشبو کے مقتل
یہاں عاشقی خوں فشاں، نیم جاں ہے
یہاں کوئی آنچل نہ دامن مقدس
یہاں دلبری صیدِ قہرِ شہاں ہے
(یہ اونچے دریچے)

سالہا سال سے انساں یہ امینِ گل ورنگ
اپنے دامن میں فقط خار لئے پھرتا ہے
یہ اجالوں کا پیمبر یہ سویروں کا انیس
اپنی قسمت میں شب تار لئے پھرتا ہے
(مسیحا)

مرا ہاتھ لوح وقلم کا مقدر
مرا دل حدیث وفا کا پیمبر!
مری روح بحر جہاں کی شناور

میں انساں ہوں توقیر ارض وسما ہوں
مگر زندگی سے تہی جا رہا ہوں
(کہانیاں)

مامتا کی رسیلی گھنی چھاؤں میں گیت گاتی ہوئی ماؤں کے نام پر
گھونگھٹوں میں حسین وجواں دلہنوں کی ابھرتی تمناؤں کے نام پر
سبز کھیتوں کے ہالے تنومند محنت کشوں حسن آراؤں کے نام پر
دور تک جگمگاتے ہوئے ہر حسیں شہر ہر سیمگوں گاؤں کے نام پر
زندگی کے امانت گزاروں کو ہر ہر قدم پر غم دار سہنا پڑا
موت کی بیکراں وسعتوں میں کڑی ظلمتوں کا ہر اک وار سہنا پڑا
(جشنِ مرگ)

نگار خانے کہ بادہ خانے تمام محروم رنگ ومستی
نہ چاند کا نور مئے میں پگھلا، نہ بام پر حسن مسکرایا
(گئے زمانے، نئے زمانے)

یہاں زندگی زہرِ غم پی رہی ہے
یہاں زندگی بن کے آؤ تو جانیں
یہاں آدمی پیار کا ہے بھکاری
یہاں پیار کو آزماؤ تو جانیں
(خیال پرستوں سے)

احمد ریاض کی غزل بظاہر غزل کے مزاج سے مختلف نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں بھی لہجے کی نرمی اور جذبے کی گہرائی موجود ہے۔

ہر داستان نے ہم کو سنایا مآلِ شوق!
پھر بھی تمہارے پیار کے دھوکے میں آگئے

کوئی بھی چیز یہاں حاصل حیات نہیں
میں جی رہا ہوں مگر کوئی خاص بات نہیں

نگار شوق نے جن کو چھپا کے رکھا تھا
وہ اشکِ غم بھی کسی کی خوشی نے چھین لیا

ہمیں کشتگانِ رہ و رسم زنداں
ہمیں باعثِ غارتِ شہریاراں
وہی لوگ معتوب دار و رسن ہیں
جنھیں آج بھی ہے یقینِ بہاراں

چمن میں دھواں اڑا کر بنام موسم گل ـــ!
بڑے غرور سے لاکھوں میں چند پھرتے ہیں
مرے شعور کو حالات راس کیوں آئیں
کہ بے شعور ابھی سر بلند پھرتے ہیں

سنتے تھے کہ حالات بدل جائیں گے لیکن
بدلے ہوئے حالات کی رفتار وہی ہے
اک جنس تجارت ہے یہاں آبروئے فن
غارتگریٔ درہم و دینار وہی ـــــ ہے

سکھ ملا چند سر بلندوں کو
دکھ سہے بے شمار لوگوں نے

جہاں کی وسعتوں میں بن تمہارے
بڑی بے چارگی سے دن گزارے
ہے اندازِ نظر کا فرق ورنہ
ترا غم بھی غمِ دوراں ہے پیارے

شب زندگی کے غبار میں جنھیں اک سحر کی تلاش ہے
وہی لوگ دار پہ کھنچ گئے وہی صد جور و ستم ہوئے

اب تو اک فیصلہ کن قدم کی ضرورت ہے اے مشترک درد کے وارثو!
اب یہ سعیٔ حصول مقاصد فقط فکر دشمن نہیں ـــــ ذکر رہزن نہیں

چلے پہ چڑھا تیر سہی تیری جوانی
بھٹکا ہوا آہو ہے مری خستہ تنی بھی
کیا کہئے کہ سائے کیطرح ساتھ رہے ہے
منزل کی تمنا بھی غریب الوطنی بھی ـــــ!

ہاں دیدہ و دل اپنے رہے صورت صحرا
کچھ کام نہ آئی تری گل پیرہنی بھی

ریاض ہم نے غم دفا کو غم جہاں سے جدا نہ پایا ـ!
کہ ان کے دامن کے پاس رقصندہ گردش روزگار بھی ہے

ہم تو بازی ہار چکے ہیں لیکن یہ سب جان چکے ہیں
کس نے غنچہ غنچہ مسلا کس نے جلتے دیپ بجھائے

کتنی یادوں کا زہراب پیتے رہے چاک دامان و شوریدہ سر منچلے
کتنے خوابوں کی شمعیں بجھاتی رہیں گھونگھٹوں میں پشیمان متوالیاں

فرط غم حوادث دوراں کے باوجود
جب بھی ترے دیار سے گزرے مچل گئے

بلا سکے نہ کبھی مل سکے نہ خود پہنچے
غضب یہ ہے کہ انھیں پھر بھی ہم بھلا نہ سکے
گئے تو مرحلۂ جوئے شیر تک پہنچے ـ!
نہ جا سکے تو ترے بام تک ہی جا نہ سکے

کیوں خزاں کے ستم اٹھائیں ہم
گر ہمیں ہو نہ اعتبار بہار

نہ کاکلوں کے گداز میں ہے نہ انکھڑیوں کی شراب میں ہے
وہ ایک لو جو بھڑک رہی ہے نظر نظر میں نفس نفس میں

زمانہ ہو چکا بزم تصور سے گئے ان کو
مگر سینے میں جلتا ہے چراغ آرزو کیسا
ہمیں یہ فخر جاگ اٹھا شعورِ عظمتِ آدم
تمہیں یہ فکر ہر سو جشنِ تعمیر و نمو کیسا ـــــ؟

اور اب اہل وفا داد ستم کیا دیں گے
تیرے ہو کر بھی ترا لطف گوارا نہ کیا
اک ہمیں گردش ایام سے فرصت نہ ملی
ورنہ کب تیری نگاہوں نے اشارہ نہ کیا
خون دل سے بھی یہاں پیاس بجھا لیتے ہیں
ہم نے ساقی ترے وعدوں پہ گزارا نہ کیا

یہ ہے بہار کے آنے کی داستاں کہ یہاں
خزاں نے کی ہے اداسنتِ بہاراں بھی

گو ترے قرب کی راحت نہ میسر آئی
تیرا غم ساتھ رہا گردش دوراں کی طرح
تیرے دیوانے بہر حال جئے جاتے ہیں
چشم حیراں کی طرح زلف پریشاں کی طرح
لوگ مومن ہی سہی کافر سہی بت ساز سہی ـ!
بات جب ہے کوئی زندہ رہے انساں کی طرح

تمہیں حیات کا حاصل سمجھ لیا ہے مگر
تمہیں ہم اپنا بنا لیں یہ دسترس بھی نہیں

کبھی فسردہ کنول ہے کبھی سلگتا چراغ
عجیب حال ہے دل کا نہ کشمکش نہ فراغ

اگر مجھے اپنی آرزوؤں کی ناتمامی کا علم ہوتا
تمام خوشیاں سمیٹ لیتا تری محبت کے غم سے پہلے
نہ نفرتیں سر بلند ہونگی نہ شورشیں سرفراز ہونگی
نہ جانے کتنا سکون ہوگا وجودِ دیر و حرم سے پہلے

جفا کا ذکر کریں گے ستم پرکھیں گے
خموش رہ کے نہ گزرے گی زندگی ہم سے
تمہارے خندۂ لب سے چھٹی نہ ظلمتِ شب
رکا نہ سیلِ ستم میری چشمِ پرنم سے

نشۂ چشم بھی، کیفیتِ مئے بھی تسلیم
بات جب ہے کہ بدل جائے مزاجِ ایام

ہم راہ و رسمِ عشق سے ناآشنا نہیں
خسرو کا سامنا ہو تو ہم کوہکن بھی ہیں
ہیں زندگی میں کتنے خم و پیچ کیا کہیں
ہم قیدِ زلف ہیں ہی اسیرِ رسن بھی ہیں

ہزار قربتِ رخسار و لب نصیب نہ ہو
دل و نظر ہیں لئے سوزِ انتظار چلو

زندگی جہدِ مسلسل ہے تماشا تو نہیں
جنکو جینا ہو وہی رہتے ہیں طوفاں کے قریب

مزاجِ گردشِ دوراں ہمیں سے ہے برہم
علاجِ گردشِ دوراں ہمیں کو کرنا ہے

ان حادثوں سے ہم پہ جو گزرے بنامِ عشق
آرائشِ فسانۂ دوراں کریں گے ہم
بزمِ جہاں کا رنگ نکھاریں گے خون سے
دامانِ زندگی کو گل افشاں کریں گے ہم
تاروں کی رفعتوں پہ اگر ناز ہو تو ہو!
ذروں کو رشکِ مہ و تاباں کریں گے ہم
چاہے غرورِ جم سے الجھنا پڑے ہمیں
ذکرِ حدیثِ عظمتِ انساں کریں گے ہم

اور کچھ دور کہ تھوڑی ہے رہِ جور و ستم
اور کچھ دیر کہ ٹوٹا درِ زنداں یارو

تم اپنے سلگتے ہوئے ماحول میں تنہا!
میں اپنے شب و روز کے زنداں میں اکیلا
تم وجہِ شکستِ غمِ ایام ہو آجاؤ
میں سہہ نہ سکوں گا غمِ ایام اکیلا
اک وہ ہیں جو آنچل کی گھنی چھاؤں میں سوئے
اک میں ہوں کہ جو سلسلۂ دار سے کھیلا

ان کے رخ سے بھی نہ پھوٹی کوئی تابندہ سحر
ان کے جلوے بھی اسیرِ غمِ ایام رہے
ہجر میں آپکی تشہیر کا سامان بنے
قرب میں اپنے لئے موردِ الزام رہے

رسم و رہِ حیات کہ دل کے معاملات
اپنی ہر ایک رنگ میں خرد سے جنگ ہے

یہ ایک جواں سال شاعر کے مختصر سے مجموعۂ کلام سے انتخاب ہے اور وہ بھی اس احتیاط کے ساتھ کہ صرف اظہار اور اسلوب کا اندازہ ہو سکے۔ جہاں تک شاعر کے فکری بلوغ کا تعلق ہے تو وہ اسکی تقریباً سبھی نظموں میں موجود ہے خاص طور پر "نئی غلامی" "احتساب" "محرومی" "طوائف اور شاعر" "ادب اور عقائد" "مجرم" "عوامی فنکار" "یہ لوگ" "دھوپ چھاؤں" "میں اور تو" "قاتل بھی مسیحا بھی" "یہ اونچے دریچے" "مرے منفرد صنم" "دیپ سے دیپ جلے" "مسیحا" "امن کی راہ پر" "ارتقا" "جگ بیتی" "جنوں سے خرد تک" وغیرہ
ان کے علاوہ عہدِ جدید کی عوامی جدوجہد کا ایک رزمیہ "عظمتِ ایشیا۔ چین" کے عنوان سے شامل ہے۔ لیکن افسوس کہ وہ نامکمل ہے اور اب کبھی مکمل نہ ہو سکے گا۔

گنتی کی چند غلطیوں کو چھوڑ کر کتابت و طباعت معیاری ہے۔ مجموعے کی ابتدا میں احمد ندیم قاسمی کا "ایک تاثر" اور آخر میں شور علیگ کا اختتامیہ مجموعہ کے تیکھے کی حیثیت رکھتا ہے۔ جن سے شاعر کی عمومی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے فن پر بے لاگ گفتگو کی گئی ہے۔
مختصراً "موجِ خوں" اپنے عصر کی روح کو سموئے ہوئے ایک ندا بھی ہے ایک نوا بھی، ایک پیغام بھی ہے اور ایک ادبی تخلیق بھی۔

لوگ کہتے ہیں

ٹنڈو محمد خان

مجبّی۔ تسلیم

گذشتہ کئی ماہ سے "منشور" کا مطالعہ کر رہا ہوں خاص طور پر سالنامہ (جنوری ۱۹۶۵ء) اپنی مثال آپ تھا۔ اتنا کم قیمت اور اتنا اچھا مواد یقین ہی نہیں آتا۔ گزشتہ شماروں میں احمد ندیم قاسمی اور حبیب جالب کی بہت عمدہ تخلیقات آپ نے چھاپی ہیں۔ سالنامہ میں شمشی فاروقی۔ سلام مچھلی شہری۔ آدر حفیظ احمد۔ فیض اور واحد بشیر وغیرہ کی بڑی اچھی تخلیقات شائع کی تھیں۔ افسانوں کا حصہ بھی کافی زوردار تھا۔ رئیس صاحب اور تقی صاحب کے مضامین بڑے فکر انگیز تھے ان حالات میں جب کہ پرچوں نے حصول اشتہارات اور زیادہ آمدنی کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے۔ آپ کا پرچہ یقیناً مشعل راہ ثابت ہوگا۔

یامین اختر

واہ کینٹ

مکرّمی!

"منشور" کا سالنامہ نظر سے گذرا اس پرچہ کو دیکھکر اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور واحد رسالہ ہے جس کو برصغیر کے ادیبوں کا تعاون حاصل ہے۔ نظم۔ غزل اور مضامین و افسانے انتہائی معیاری اور بلند پایہ ہیں۔ ان تمام خوبیوں پر مستزاد یہ کہ قیمت کے لحاظ سے اتنا کم کہ ہر شخص بآسانی خرید کر پڑھ سکتا ہے۔ یقیناً ان تمام خوبیوں پر آپ کا ارادہ مبارکباد کا مستحق ہے

قیصر عابدی

ویجاپور (مہاراشٹر)

برادرم۔ آداب ونیاز

اورنگ آباد آنے سے پہلے ہی چونکہ اپریل کا تازہ شمارہ مل چکا تھا۔ لیکن کچھ مصروفیت کے باعث جواب نہ دے سکا۔ معذرت خواہ ہوں۔

"منشور" کا یہ پہلا شمارہ ہے جو میری نظر سے گذرا۔ پرچہ ہر لحاظ سے لائق ستائش ہے اور انفرادیت رکھتا ہے دوسرا اچھے لکھنے والوں کا قلمی تعاون بھی آپ کو حاصل ہے۔ جو کسی بھی رسالے کی کامیابی کے لئے نہ صرف ضروری بلکہ لازمی ہے۔

قمر اقبال

کراچی

محترم۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاۃ۔

ایک طویل عرصہ کے بعد میری نظر اتفاقاً "منشور" پر پڑی بک اسٹال پر کھڑے کھڑے سرسری طور پر دیکھا اور اس کے بعد گھر لا کر پرچے کو پڑھا "منشور" کے سرورق پر ۹ جنوری ۱۹۶۵ء چھپا تھا۔ لیکن نیچے کی لائن میں مارچ ۱۹۶۵ء دیکھ کر سانس لی۔ ہمارے یہاں کتابت کا فن جس تیزی سے فن کی حیثیت ترقی کرتا جا رہا ہے اس تیزی سے کاتب صاحبان (معاف فرمائیں) کتابت کی غلطیوں کے فن میں مہارت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ بہرحال منشور اب اس منزل سے گزر گیا۔ جہاں سے تعریف توصیف کا سلسلہ لامتناہی شروع ہوتا ہے۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ خالق کائنات کی پیدا کی ہوئی مخلوق کی ترجمانی کے لئے اہل ہمت نے قدم بڑھانا شروع کیا ہے۔ پرچہ جہاں مزدوروں کی ترجمانی کرتا ہے وہیں سسکتی اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کو بھی سنبھالنے کے فرائض بخوبی انجام دے رہا ہے۔ میں آپ کے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے دست بدعا ہوں۔

محمد عباس انصاری بھوپالی

ٹنڈو محمد خان

مکرّمی۔ السلام علیکم

گاہ بہ گاہ آپ کا "منشور" نظر نواز ہوتا رہتا ہے ایسے معیاری مضامین اور اشعار کم ہی نظر آتے ہیں۔ دل خوش ہو جاتا ہے کتنے زخم کھل جاتے ہیں اور کتنے ہی مندمل ہو جاتے ہیں۔ گویا زندگی کا مزہ آجاتا ہے۔

شاد بھٹوی

الہ آباد

برادرم۔ آداب

"منشور" کا تازہ شمارہ ملا۔ عنایت کا شکریہ۔ منشور دن بہ دن نکھرتا جا رہا ہے۔ سالنامہ تو خیر ایسا ہے جسے اچھے خاصے معتبر رسائل بھی اپنا آئیڈل بنا سکتے ہیں۔ عام شمارے بھی کم وقیع نہیں ہوتے۔

شمیم حنفی

سید پور (مشرقی پاکستان)

مکرّمی تسلیم!

کل اچانک ماہنامہ "منشور" کا ایک پرانا رسالہ نظر آیا۔ پہلی ہی نظر میں اس کے حسن و دلکشی میں گم ہو گیا۔ ان سے لیکر دیکھا سرسری طور پر پڑھا اور یقین جانئیے بے اختیار "واہ" نکل پڑا

واقعی آپ کی محنت اور آپکا خلوص قابل ستائش ہے اور پھر قیمت بھی صرف پچیس ۲۵ پیسے

مجھے رسالہ ہر لحاظ سے بہت ہی پسند آیا اور ہمارے ساتھیوں کو بھی پسند آیا۔

زین العابدین احد

واہ کینٹ

مکرّمی تسلیم

اپریل کا "منشور" ملا پرچہ کا رحجان دیکھکر خوشی ہوئی۔ نظموں کے لئے اگر چند صفحات مخصوص کئے جا سکیں تو اور اچھا ہو۔ بہرحال آپ کی کوششیں امید افزا ہیں۔

احمد جمیل

ٹنڈو محمد خان

مکرمی - پرخلوص یادیں

"منشور" عرصے سے زیرمطالعہ ہے اتنا معیاری اتنا خوبصورت پرچہ آپکی کاوش کا نتیجہ ہے۔ تازہ شمارہ بڑا جاندار ہے۔ حصۂ نثر میں مجتبیٰ صدیقی کا "انسان عظیم" ہے سید نجم الحسن کا "کشکول" اور حصۂ نظم میں مجیب خیرآبادی۔ ادیب سہیل فیروز نظر۔ مثال رضوی کی تخلیقات بے حد پسند آئیں۔

احمد علیم

امروہہ

میرے عزیز دعائیں۔

بہت دن ہوئے "منشور" کا شاید پہلا یا دوسرا ہی شمارہ تھا۔ اس وقت نہ جانے کیوں یہ سمجھا تھا کہ یہ کوئی اس قسم کا رسالہ ہے جیسے اکثر نکلتے رہتے ہیں اور اچھے خاصے نکلتے نکلتے ایک دم بند ہو جاتے ہیں اس وقت معلوم نہیں کیوں میں نہ پی۔ آئی۔ اے یونین کا مطلب سمجھا تھا اور نہ تمہارے نام کی اس سے وابستگی کا احساس مجھے ہو سکا تھا اور میں نے اسے یوں ہی بیکار سی چیز سمجھ کر کہیں پھینک دیا دیا تھا اب مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں نے اس وقت غلطی کی تھی — ہاں اب۔ جب کہ تمہارا سالنامہ میری آنکھوں کے سامنے ہے، ہمارے اس برصغیر میں اتنا دیدہ زیب۔ اتنا خوبصورت۔ بھاری بھرکم، ہلکا پھلکا۔ زیورِ حسن وسیرت دونوں سے آراستہ سالنامہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس پر میری دلی مبارک باد قبول کرو۔ تمہارے نیک ارادوں۔ انتھک کوششوں۔ اور ذہانت اور صلاحیتوں سے امید کی جاتی ہے کہ تم اسے بہتر سے بہتر بنا لوگے۔ اور جب ابتدائی منزلوں میں یہ صورت ہے تو آخری منزل کیا ہوگی اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے زندہ باش!

تمہارا افسانہ بہت خوب ہے ویسے سب ہی چیزیں خاصے کی ہیں۔ رئیس کا مضمون جسے انہوں نے افسانوی رنگ دے کر غیر معمولی طور پر دلچسپ بنایا ہے۔ نقی کا مقالہ، جون کی غزل سب بہت خوب ہیں "پیٹ پالوں کہ تجھ سے پیار کروں" بہت سے لوگ شاید اس کی داد نہ دے سکیں۔ مگر جون جس طرف چل رہے ہیں میرے نزدیک وہی حقیقی شاعری ہے۔ تم نے جس طرز کو اپنایا ہے، میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔ تمہارے افسانوں کی زبان اور ماحول ہماری اس قدیم بستی کی روایتی تہذیب کی عکاسی کرتے ہیں جو میرے نزدیک مستحسن ہے تم نئی شاہراہیں ضرور تلاش کرنا۔ لیکن خدا کے لئے اس طرز کو ترک نہ کرنا۔

قیصر تمکین کا جو افسانہ تم نے شائع کیا ہے وہ انھوں نے یہاں انجمن تعمیر اردو کے سالانہ ادبی اجتماع میں سنایا تھا۔ اس پر مجھے کچھ اعتراض ہے پہلی بات یہ کہ کوئی مسلمان کبھی "اعتراف" کے لئے پادری کے پاس کبھی نہیں جا سکتا۔ آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ مجید نے جو کچھ فادر پارسی سے کہا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ مانا کہ یہ بھی جھوٹ تھا کہ مجید مسلمان تھا۔ لیکن یہ بات محل نظر ہے کہ فادر پارسن نے ایک مسلمان کی یہ داستان کیوں سنی۔ جب کہ وقت بھی غیر تھا اور فادر اس وقت اعتراف نہیں سنتا تھا۔ تاوقتیکہ "کوئی شخص بستر مرگ پر نہ ہو"۔ اس کے علاوہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مجید فادر پارسن کے پاس کس مقصد کے لئے گیا تھا۔ جب کہ اس نے (غالبًا)، فادر کا دیا ہوا نوٹ بھی واپس کر دیا۔ ایشیا میں بھوک ضروری ہے۔ مگر لوگ پیٹ بھرنے کے لئے ڈبل روٹی کے سلائیس نہیں روٹی کے لقمے کھاتے ہیں ....
معلوم ہوتا ہے کسی انگریزی کہانی کا ترجمہ ہے جسے ہندوستانی لباس پہنانے کی کوشش کی گئی ہے جو ناکام ہے۔

سخی حسن

ماہنامہ منشور کراچی

جولائی سنہ ۱۹۶۵ء

میں

افروایشیائی اتحاد نمبر

پیش کر رہا ہے

اہل قلم سے تعاون کی درخواست ہے!

REGD.NO. S - 2575

THE MONTHLY MANSHOOR KARACHI